سہیل عظیم آبادی

چار چہرے

پہلی بار ــــــــــ ۱۹۷۷ء

تعداد ــــــــــ آٹھ سو

خوش نویس ــــــــــ ابوالکلام عزیزی

طابع ــــــــــ نامی پریس

قیمت ــــــ

ناشر

نصرت پبلشرز۔ کپور مارکیٹ لکھنؤ

انتساب

والد مرحوم

سید حبیب الرحمٰن صاحب کے نام

جن کی بے پایاں محبتوں نے ہر قدم پر میرا حوصلہ
بڑھایا۔ اور جن کی نصیحتیں میرے لیے آج بھی
مشعلِ راہ ہیں۔ اور آئندہ بھی رہیں گی۔

سہیل عظیم آبادی

بدصورت لڑکی

سیپ (کراچی) ۱۹۶۴ء

بدصورت لڑکی

"دیدی پرنام"

موہنا نے اچانک کمرے میں آکر سلام کیا۔ چندرا چونک پڑی "ارے موہنا" کہتی ہوئی پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور "میرا پپو" کہہ کر ہاتھ پھیلائے اُس کے بچے کی طرف بڑھی۔ پپو ڈر کر چیخ اُٹھا۔ اس کی ماں تیزی سے کمرے میں آئی اور پپو کو موہنا کی گود سے لے کر باہر چلی گئی۔ جب پپو اور زیادہ چیخنے لگا تو موہنا بھی ماں کی پکار پر باہر چلی گئی اور بچے کو چُپ کرانے لگی۔ چندرا کا سر چکرا گیا اور آنکھوں کے سامنے موٹا سا پردہ چھا گیا۔ نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ ایک پل کے لئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہوا۔ اور وہ کہاں ہے زمین پر یا ہوا میں۔ لیکن اس کی یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ وہ جلد ہی سنبھل گئی اور ساری باتیں صاف صاف سمجھ میں آ گئیں۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی لیٹی ڈھائی تین گھنٹوں سے ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اپنے بچے کو لئے اچانک آ گئی تھی۔ اس نے بچے کو پیار کرنا چاہا تھا مگر بچہ ڈر گیا تھا اور اس کی ماں بچے کو باہر لے کر چلی گئی تھی۔ پھر

موہنا بھی چلی گئی۔ اور بچے کو چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بچہ اب بھی روئے جا رہا تھا۔ کتاب تکیئے کے پاس اسی طرح آدھ کھلی پڑی تھی، جس طرح ذرا تھوڑی دیر پہلے اس نے رکھی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ ناول میں کھوئی ہوئی تھی اور ایسی جگہ پہنچی تھی جہاں ناول میں الجھن اور دلچسپی دونوں ہی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ چندرا چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی اور ناول کی کہانی اس کے دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔

کامنی جوان تھی اور بیاہ کا کھیل بھول گئے سے پہلے بیوہ ہو گئی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ رواج کی پابندی اور پیار میں اس کا بیاہ اسی وقت کر دیا گیا تھا جب وہ دس سال کی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی وہ بیوہ ہو گئی تھی اور جب جوان ہوئی تو بیوہ تھی اور ماں باپ کی چھاتی کا بوجھ کل کی ریت کے مطابق اسے ساری زندگی بیوہ رہنا تھا۔ اسے کامنی نے سمجھا اور زندگی کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج میں پڑھتی رہی کہ زندگی میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ اور اس نے بی۔ اے کر لیا۔ سوچا تو اُس نے یہ تھا کہ کسی اسکول میں پڑھانے کا کام کرے گی لیکن اس کے باپ نروتم لال کو فالج آگیا، وہ پلنگ پر پڑ گیا اور دو چار مہینے گزارنے کا بھی سہارا نہ رہا۔ پنڈت نروتم لال کے بچپن کے ساتھی اور اس کارخانے کے مالک جہاں وہ کام کرتا تھا، پنڈت امر چند کو یہ خیال ہوا اور وہ نروتم لال کو سمجھا بجھا کر کامنی کو اپنے کارخانے میں لے آئے اور اپنا سکریٹری بنا لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نروتم لال کو کوئی تکلیف نہ ہو اور کامنی ان کی نگرانی میں رہے۔ نروتم لال کے بعد یوں بھی اُس کو ایک بھروسے کے آدمی کی ضرورت تھی جو ہر چیز پر نگرانی رکھے۔ خاص کر کاغذات پر۔ نروتم لال کی بیماری سے وہ بالکل اکیلے پڑ گئے تھے۔ اُن کا بیٹا چار سال سے امریکہ میں تھا

اور ابھی اس کے آنے میں دیر تھی۔

اتول جب کام سیکھ کر واپس آیا اور اپنے موٹر کے کارخانے کی دیکھ بھال کرنے لگا تو کامنی امرچند کی سکریٹری بن چکی تھی۔ کارخانے کے ایک طرف دوسری منزل پر کئی کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پنڈت امرچند بیٹھتے تھے اور اس کے بغل والے کمرے میں کامنی۔ جس میں اس سے پہلے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ کمرہ بھی ایسا بنا ہوا تھا کہ بیچ کا دروازہ کھلنے سے ایک ہو جاتا تھا اور وہ ہر وقت پنڈت جی کی نظر کے سامنے رہتی تھی۔ جب اتول آیا تو پنڈت جی کے پاس ہی اس کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح پنڈت امرچند، اتول اور کامنی پاس پاس ہی بیٹھتے تھے۔ کامنی نے سارے کاموں کو سمجھ لیا تھا اور سارے دفتر پر چھا گئی تھی۔ پنڈت امرچند اور اتول کے سوا کارخانے کے سارے لوگ اسے بہن جی کہتے تھے اس لئے بھی کہ وہ پنڈت نروتم لال کی بیٹی تھی اور وہ کارخانے کے ہر آدمی کو ان کی مہربانیاں یاد تھیں۔ ایک بوڑھا لال محمد مستری تھا جو اسے گموجی کہتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ پنڈت نروتم لال نے اسے نوکر رکھا تھا اور کامنی جب چھوٹی تھی تو اسے گودی میں کھلایا تھا۔

کامنی کارخانے کے لئے اور اس سے بھی زیادہ پنڈت امرچند اور اتول کے لئے ضروری بن گئی تھی۔ جس طرح وہ ہر کاغذ کو جان گئی تھی۔ اسی طرح پنڈت امرچند اور اتول کو بھی۔ اور اسی طرح دونوں کا خیال رکھتی تھی۔ پنڈت امرچند کو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ ان کے لئے سگار کے پیکٹ سے لے کر ناشتہ کے لئے مکھن اور جام تک وہی منگاتی تھی اور انہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی تھی تو کامنی سے کہتے تھے۔

اتول کو پہلے تو یہ بات بہت کھٹکی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ کامنی کی ضرورت کو

سمجھنے لگا۔ دفتر کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ دونوں چھ چھ گھنٹے ساتھ رہتے تھے اور بچا یوں بار دفتر کی باتیں کرتے تھے۔ لیکن اور کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کامنی نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ کوئی کاغذ لے کر اتول کے پاس گئی تھی تو اتول نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو عام نظروں سے الگ ہوتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اتول کی زبان بولتے بولتے لڑکھڑا جاتی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کبھی کبھی اتول اسے خالی نظروں سے ٹک رہا ہے اور جب دونوں کی نظر مل گئی ہے تو وہ گھبرا گیا ہے۔ جلدی سے نظر جھکالی ہے اور سٹ پٹا گیا ہے۔ کبھی کبھی اس نے یہ دیکھا کہ اتول اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا ہے اور اس نے بھی اپنے دل میں گدگدی محسوس کی ہے۔ لیکن دونوں کے بیچ میں پنڈت امر چند بیٹھے تھے جو پہاڑ کی طرح دونوں کو دو طرف رکھے ہوئے تھے۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے لیکن دونوں دور تھے۔

پنڈت امر چند دولت مند آدمی تھے اور ان کے پاس پہلے بھی کئی سکریٹری کام کر چکے تھے لیکن کامنی والی بات کسی میں نہ تھی۔ وہ پنڈت امر چند اور اتول کو اس قدر جان گئی تھی کہ اسے کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اگر وہ پنڈت جی یا اتول کو کاموں میں الجھا دیکھ لیتی اور اندازہ کر لیتی کہ کھانے کے لئے گھر جانے کا وقت نہیں ہے یا زیادہ دیر میں چھٹی ہوگی تو آدمی بھیج کر گھر سے کھانا منگوا لیتی اور وقت پر کھلا دیتی۔ اگر شام کے وقت انھیں کہیں جانا ہوتا اور وہ سمجھ لیتی کہ گھر جانے کا وقت نہیں ملے گا تو آدمی بھیج کر ان کے کپڑے منگوا دیتی اور وہ صاف کپڑے بدل کر چلے جایا کرتے۔ جب تک وہ دفتر میں رہتی دفتر کے کاغذات اور دونوں باپ بیٹے کے آرام کے خیال میں ہر وقت الجھی رہتی اور اتول کی بھی عادت تھی کہ ہر کام کامنی پر چھوڑ دیتا۔ خواہ وہ ضروری خطوں کو ٹائپ کرا کے ایک نظر دیکھنے کے بعد پنڈت امر چند سے دستخط کرانے ہوں،

یا کسی کے لئے کپڑے خریدنے ہوں، اور کامنی سارے کام خوشی سے کرتی۔ ایسے کام بھی جو اس کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اور اس طرح وہ پنڈت امرچند اور اتول کی زندگی میں رس بس گئی تھی۔ دونوں ایک ہی بات محسوس کرتے تھے اور وہ یہ کہ کامنی کو الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن اتول اسے بہت زیادہ محسوس کرتا تھا۔

پنڈت امرچند دن بھر دفتر میں رہتے تھے اور دونوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات بھی نہ دیکھی تھی جو دونوں میں سے کسی پر کوئی شک ہوتا۔ انہوں نے دونوں کو بے ضرورت باتیں کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کامنی دن بھر اپنی میز کے سامنے بیٹھی کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھا کرتی تھی اور بے ضرورت کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتی تھی یا کاغذ پر سے نظر اسی وقت ہٹاتی جب کوئی اس سے کچھ پوچھتا۔ پنڈت امرچند بہت خوش تھے ان کا سارا کام کامنی کی وجہ ہلکا ہو گیا تھا۔ لیکن اتول سمجھنے لگا تھا کہ اگر کسی وجہ سے بھی کامنی نہ رہی۔ تو پھر اس کے لئے کوئی کام کرنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ اتول جو کچھ جاننا چاہتا تھا، کامنی اسے بتاتی تھی۔ کارخانے کے بارے میں یا دفتر کے بارے میں اسے خود کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ کہ اتول کبھی کبھی سوچنے لگتا تھا کہ کیا کامنی جیسی دوسری سمجھدار عورت اور بھی مل سکتی ہے جسے وہ اپنی جیون ساتھی بنائے۔ نیک، سادہ، سمجھدار اور خوبصورت۔ کچھ نہ بولنے پر بھی کامنی نے اتول کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی اور کامنی بھی سوچا کرتی تھی کہ ان دونوں باپ بیٹوں کی طرح سیدھا سادھا اور شریف اور بھی ہوگا۔ پنڈت امرچند تو خیر بوڑھے آدمی تھے لیکن اتول نوجوان تھا اور وہ جانتی تھی کہ آج کل کے جوان کیسے ہوتے ہیں۔ ہر روز بہت سے جوانوں کو دیکھتی تھی اور ان کی نظر کو پہچانتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں گرمی محسوس کرتے تھے لیکن شرم سے کامنی کچھ نہ بولتی تھی اور اتول باپ کے ڈر سے۔

ایک دن کامنی ذرا دیر کرکے آئی۔ ایک ضروری خط پر پنڈت امر چند دستخط کر چکے تھے اور اتول نے بھی اسے دیکھا تھا مگر وہ خط بھیجا نہیں گیا تھا۔ کامنی آگئی تو اس نے دیکھا اور فوراً پنڈت جی کے پاس پہنچی انہیں سمجھایا کہ اس خط کو بھیجنے سے ہزاروں کا گھاٹا ہو جائے گا۔ اور خط کو روک کر دوسرا خط بھجوایا۔ اس دن پنڈت امر چند نے خوش ہو کر کہا تھا۔ کامنی تم نوکر نہیں ہو میرے بچپن کے ساتھی کی بیٹی ہو میری بھی بیٹی ہو۔ میرے بعد تم ساری زندگی کہیں اور کام کرنے کی بات نہ سوچنا۔ اتول تمہارا بھائی ہے۔ ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ رہنا اور اس کی خبر گیری کرنا" اتول بڑا سیدھا سادھا اور بے پروا ہے۔

لیکن کامنی نے ان کی بات سن کر محسوس کیا تھا کہ پنڈت امر چند نے اس کے دل پر گھونسا مارا تھا۔ اور اس کا سر چکرا گیا تھا۔ اگر یہی بات وہ تین چار مہینے پہلے کہتے تو وہ خود کو سنبھال لیتی۔ مگر اس وقت انہوں نے کہا تھا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دو ڈھائی مہینہ پہلے جب پنڈت جی کو بخار آگیا تھا اور پندرہ دنوں تک کارخانے نہیں آئے تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اور دونوں کے دلوں کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ جس بات کو دونوں نے بہت دنوں تک دل کی گہرائی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک دم اوپر آگئی تھی۔ ایک دن بہت سے ضروری خط بھیجنے تھے۔ کارخانے میں نیچے چند آدمی کام کر رہے تھے اور سارے لوگ جا چکے تھے۔ بس اتول بھی خطوں پر دستخط کر کے جانے والا تھا۔ جب کامنی سارے خط لے کر اس سے دستخط کرانے آئی تو اتول نے پاگلوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس سے بیاہ کی باتیں چھڑتی ہیں لیکن وہ برابر انکار کرتا جا رہا ہے۔ پہلے تو کامنی نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ بیوہ ہے اور کل کی ریت کے مطابق اس کا دوسرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔

اگر وہ کل کی ریت کو ٹھکرا کر تیار بھی ہو جائے تو نہ تو اُس کا باپ تیار ہو گا اور نہ پنڈت جی۔
دونوں پرانے خیال کے آدمی ہیں اور وہ دو میں سے کسی کو بھی دکھ پہنچانا نہیں چاہتی۔ کام کی
وجہ سے ماننا اور بات ہے۔ لیکن پنڈت امر چند کیسے پسند کرتے کہ ان کا اکلوتا بیٹا ایسی لڑکی
سے بیاہ کرے جس کا باپ ان کے ہاں نوکر تھا اور جو اب خود نوکر ہے اور بیوہ بھی ہے۔
پنڈت جی کسی دولت مند گھر کی کنواری لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گے جو اپنے ساتھ لاکھوں کا
سامان لائے۔ لیکن اتول پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہوا اور اس نے کامنی کا ہاتھ اُس
وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس نے بھی محبت کا اقرار نہ کر لیا۔ اتول نے اس سے کہا
تھا کہ موقع پا کر ماں باپ سے اپنے دل کی بات کہے گا اور انہیں رضامند کر لے گا۔ اور اگر
وہ نہ مانے تو بیاہ کی بات کو ٹالتا ہی جائے گا اور اس دن کا انتظار کرے گا جب وہ آزاد
ہو گا اور اس وقت اس سے بیاہ کر لے گا۔ اس نے بھی سوچا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اتول
کے ساتھ زندگی گزار دے گی۔ اتول نیک اور شریف تھا اور اس سے محبت کرتا تھا اگر اتول جوانی
کے ترنگ میں کوئی غلط فائدہ اٹھانا چاہتا تو ضرور ایسی ویسی باتیں کہتا۔ لیکن اُس نے کوئی ایسی
بات نہیں کہی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز سنیما دیکھنے جاتا تھا مگر کبھی سنیما چلنے کو بھی نہیں کہتا
تھا۔ اسے یقین تھا کہ اتول سچ مچ اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔
وہ دل میں سوچا کرتی تھی کہ بالکل بے سہارا نہیں ہے۔ لیکن جب پنڈت امر چند نے اس سے
کہا کہ اتول کو نہیں چھوڑے گی اور بھائی کے ساتھ ساری زندگی گزار دے گی۔ اس دن اس نے
فیصلہ کر لیا کہ وہ ساری زندگی اتول کے ساتھ رہے گی۔ لیکن اور دوسری باتیں دل سے نکال
دے گی۔ وہ اپنی محبت کو قربان کر دے گی اور اتول کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ بلکہ بہت جلدی

بیاہ کر لینے پر آمادہ کرلے گی۔ پھر سوچے گی کہ زندگی کے باقی دن کس طرح کاٹے۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ ایک آگ میں جل رہی تھی اب دوسری آگ میں جلنے کے لئے خوشی سے تیار تھی۔ اسے صرف ایک فکر تھی اور وہ اتول کی۔ کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی تھی جس سے اُسے دکھ پہنچے۔ اس نے بڑی عقل مندی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتول کے بیاہ کی باتیں کئی جگہ سے آئیں اور وہ کسی نہ کسی بہانے سے انکار کرتا گیا۔ ماں باپ تھک گئے تھے۔ جب شہر کے بڑے کاروباری پنڈت اونکار ناتھ کی بیٹی سمترا سے اتول کے بیاہ کی بات چلی۔ تو پنڈت امرچند نے کامنی سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے پسند کیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی اتول سے بات نہ کی جائے۔ کہیں وہ پھر پہلے کی طرح کوئی بہانا نکال کر انکار نہ کر دے۔ اور پنڈت جی سے کہا تھا کہ یہ بات اس پر چھوڑ دی جائے وہ اتول کے مزاج کو سمجھتی ہے اور اسے رضامند کرلے گی۔ پنڈت جی کو کامنی کی عقل پر بڑا بھروسہ تھا اور انھوں نے یہ کام کامنی پر چھوڑ دیا تھا اور کامنی نے طے کر لیا تھا کہ بیاہ کرا کے رہے گی اور اپنے کل کی مریادا کو بچا کر رکھے گی۔

سمترا کا بھائی راجن اتول کا دوست تھا۔ ہر روز شام کے وقت دونوں ساتھ سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ کامنی نے اس سے کہا کہ کلب کے بدلے اتول کو اپنے گھر لے جایا کرے اور وہیں تاش کھیلا کرے۔ اس طرح اتول اور سمترا کو ایک دوسرے کو جاننے کا موقع مل جائے گا سمترا خوبصورت بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی۔ کامنی کو یقین تھا کہ اتول سمترا کو جان لے گا اور اس سے بیاہ کی بات مان لے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو دھکا سا ضرور لگتا مگر وہ فوراً سنبھل جاتی۔ اور سوچتی ایک چیز کو بنانے کے لئے دوسری چیز بگاڑنی ہی ہوتی ہے۔ اتول کی زندگی کو بنانے کے لئے اسے اپنے دل پر ایک اور زخم کھانا ہی پڑے گا۔ اب اس کی زندگی

ہی کیا تھی۔ جو تھی وہ بگڑ چکی تھی۔ اور اگر وہ اسے دوبارہ بنانے کی کوشش کرے گی تو کل کی مریادا بگڑ جائے گی اور اگر کل کی مریادا ہی جاتی رہی تو پھر زندگی بنی کیا' برباد کی برباد رہی۔

وہ ہر روز راتول کو راجن کے ساتھ زبردستی بھیج دیتی اور راجن گھما پھرا کر اپنے گھر لے جاتا پھر وہاں اپنی بیتی اور سمترا کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا یا اور کوئی پروگرام بنتا سب کے ساتھ۔ اور ایک ڈیڑھ مہینہ کے بعد جب اس نے راتول سے پوچھا کہ سمترا کیسی لڑکی ہے اور وہ مسکرا کر رہ گیا تھا تو کامنی کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب پنڈت جی سے کہہ دے گی کہ بات پکی کر لیں مگر پھر بھی وہ کئی دنوں تک نہ کہہ سکی۔ ہر روز سوچتی اور ہر روز اس کی زبان بند رہ جاتی۔ اپنے طور پر اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ پنڈت جی سے کہنے کے بعد ماں باپ کو لے کر بنارس چلی جائے گی۔ جہاں اس کی دولت مند پھوپھی اس لئے رہتی تھی کہ وہاں مرے اور گنگا کے کنارے جلائی جائے۔ اس نے بھی کئی بار بھائی اور بھاوج کو بلایا تھا مگر کامنی راستے میں رکاوٹ تھی۔ اب کامنی تیار تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اس سے اچھی زندگی اور موت کیا ہوگی کہ جب تک زندہ رہے صبح شام بھگوان کے درشن ہوں اور جب مرے تو گنگا کے کنارے جلائی جائے' اور اس کی راکھ کو گنگا کی موجیں سمیٹ لیں۔ کوئی نیک مرد و عورت اس سے اچھی زندگی اور موت اور سوچ بھی کیا سکتی ہے۔ پھر بھی یہ سوچ کر سہم جاتی کہ اس طرح چلے جانے کا اثر راتول پر کیا ہوگا اور کیا سمترا بھی اسے راتول کے دل سے نکال سکے گی؟ وہ تو راتول کے راستے سے الگ ہو جانا چاہتی تھی مگر خود اپنے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نظر نہیں آتا تھا اور یہ اس کے لئے ناممکن تھا کہ ایک بار راتول سے محبت کا اقرار کر لینے کے بعد اس کے لئے بہن کا جذبہ دل میں پیدا کرے اور اس کے ساتھ رہے۔ نہ جانے کتنی راتوں کو راتول کے ہاتھوں

کو اس نے اپنے گلے میں محسوس کیا تھا اور اس کی گرم سانسیں اپنے گالوں پر محسوس کی تھیں۔ تھا تو یہ سب خیال، لیکن وہ دل ہی دل میں اتول کو اپنے دل کا مالک مان چکی تھی۔ دل ایک طرف تھا اور دماغ دوسری طرف۔ کبھی دماغ دل کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا تھا۔ کبھی دل دماغ کو دبوچ لیتا اور آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

چندرا ناول پڑھتی جا رہی تھی اور یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ کامنی اس الجھن سے کس طرح نکلتی ہے اور اتول کیا کرتا ہے۔ کہانی کہاں اور کس طرح ختم ہوتی ہے۔ کامنی نے پہلے بھی دوبار ایسا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بار تو اس نے رات کو فیصلہ کیا کہ کام کرنا چھوڑ دے گی لیکن دوسرے دن خود ہی اٹھ کر دفتر میں آ گئی تھی۔ اور ایک بار اس نے استعفا لکھ کر بھیج دیا تو خود پنڈت جی جا کر اسے لے آئے۔ اس دن اتول اس سے دن بھر نہ ملا اور وہ اتول سے الگ بھی نہ ہو سکی۔ بھاگنے کے سارے راستے بند تھے۔ ایک طرف اتول تھا دوسری طرف پنڈت جی اور اس کے ماں باپ اور کل کی مریادا۔

چندرا کو افسوس ہوا کہ موہنا ایسے وقت میں کیوں آگئی اور آئی تو بچے کو لے کر کیوں آئی۔ اس کا پڑھنا بھی خراب ہوا۔ اور بچہ بھی ڈر گیا اور اب تک رو رہا تھا۔ وہ گھر کے سارے لوگوں سے الگ کمرے میں لیٹی ناول پڑھتی رہتی تھی اور سب نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا جس طرح چاہے زندگی کے دن کاٹے۔ اور ناول پڑھنے سے اسے بڑا سہارا ملا تھا۔ ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دکھوں کا خیال کرنا بھی بے کار ہے۔ آدمی دکھوں کی گودی میں پیدا ہوتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے طرح طرح کے دکھ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ زندگی نام ہی ہے دکھوں کو جھیلنے اور ان کا مقابلہ کرنے کا۔ اور خوشی ان پلوں اور گھڑیوں کا جب آدمی ان دکھوں

پر قابو پالیتا ہے اور دکھوں کے پنجے سے نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا میں وہ اکیلی دکھی نہیں ہے۔ ہر آدمی دکھی ہے۔ کسی کو کوئی دکھ ہے اور کسی کو کوئی دکھ۔ دکھوں سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے اور ان دکھوں میں سے خوشی کا کچھ وقت نکال لینا ہی انسان کی بڑی کامیابی ہے۔

چندرا کی زندگی دکھوں کی ندی میں تنکے کی طرح بہتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کب اور کس کنارے لگے گی یا اسی طرح بہتے بہتے کسی دن بیچ دھارے میں ڈوب جائے گی۔ لیکن جب سے اس نے ناول پڑھنا شروع کیا تھا تو اپنے کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اگر آدمی اپنے دکھوں کو بھول کر دوسرے کے دکھوں میں شریک ہو جائے تو اپنے دکھوں کو بھول سکتا ہے۔ بلکہ دوسروں کی مدد کر کے خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بھولنا شروع کر دیا تھا اور اپنے دکھوں میں کمی پاتی تھی۔ اس کے دل کے اندر دوسرے آدمیوں کے لئے اتھاہ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اور کبھی کبھی محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے کوئی دکھ ہی نہیں ہے وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کر سکتی ہے جو سچ مچ دکھوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ دکھ بھی انسان کے لئے ہوا، پانی اور اناج کی طرح ضروری ہے اس سے چھٹکارا ہی نہیں۔ دنیا کا سب سے دکھی آدمی وہی ہے جسے کوئی دکھ نہیں رہ جائے۔

چندرا کی زندگی عجیب تھی۔ شہر کے نامی وکیل کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ تین اور چھوٹی بہنیں تھیں۔ بچپن ہی سے بدصورت تھی۔ جب تک چھوٹی تھی کوئی نہ کوئی بیماری اُسے دبوچے رہتی تھی۔ کالی تو تھی ہی ایک بار چیچک نکل آئی تو رہی سہی کمی بھی پوری ہو گئی۔ سارے بدن پر بڑے بڑے داغ پڑ گئے تھے۔ ناک کچھ بیٹھ گئی۔ آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ ماں باپ پر فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ تینوں بہنیں صورت شکل کی اچھی تھیں مگر یہ سب کی راہ کا پتھر بن گئی تھی۔ پڑھنے لکھنے

میں تو بہت اچھی تھی مگر پڑھنا لکھنا تو سب کچھ نہیں اور وہ بھی لڑکی کے لیے۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی۔ ماں باپ کے دل کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ خود اس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ماں باپ اور رشتہ داروں نے کوشش کی کہ یہ بوجھ اٹھا کر کسی اور کے کندھے پر ڈال دیں مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔ اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے کوئی کندھا بڑھانے کو تیار نہ ہوا بلکہ جس کی طرف لوگ بڑھتے وہ ہٹ جاتا۔ مجبور ہو کر ماں باپ نے دوسری بیٹی للتا کا بیاہ کر دیا۔ آخر ایک کے لئے دوسروں کو کب تک بٹھائے رہتے۔ پھر دو سال کے بعد تیسری بیٹی اُما کا بھی بیاہ ہو گیا اور ایک سال کے بعد سب سے چھوٹی موہنا کا بھی۔ لیکن وہ سب سے بڑی تھی جو بیٹھی رہ گئی۔ چندرا کو کوئی بر نہیں ملا۔ اور اس پر جوانی آئی تو ساون بھادوں کے بادل کی طرح ٹوٹ کر برس جانے کو بے چین۔ نہ جانے بچپن کی ساری بیماریاں اب کہاں چلی گئی تھیں۔ اس کا سارا بدن تازہ منڈھے ہوئے ڈھول کی طرح تنا ہوا تھا۔ ذرا سی چوٹ لگے اور ٹھن ٹھن بول اٹھے جب وہ بلاؤز پہنتی تو کہنیوں سے اوپر پھنس جاتا اور آستین میں پھنس کر بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتیں۔ اور وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ جب ذرا سانس لیتی تو ایسا لگتا کہ بلاؤز کے سارے بٹن تڑ تڑ ٹوٹ جائیں گے۔ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی، اور دل تڑپ کر باہر نکل آئے گا۔ اس وقت وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی اور اس کا جی چاہتا کہ سارے کپڑے اُتار پھینکے اور جوڑ جوڑ کو آزاد کر دے۔ وہ سانس روک لیتی اور اس کا جی چاہتا سچ مچ چھاتی پھٹ جائے اور ساری الجھن ختم ہو جائے مگر نہ چھاتی پھٹتی تھی اور نہ الجھن ختم ہوتی تھی۔

ماں باپ نے کیا کوشش نہیں کی۔ مگر چندرا کے لئے کوئی بر نہیں ملا۔ ماں باپ نے تو اُسی وقت اس کے بیاہ کی بات شروع کر دی تھی جب وہ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔

انھیں اندازہ تھا کہ دولت ہونے پر بھی چندرا کے لئے بر ڈھونڈ لینا پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنے سے کم کٹھن کام نہیں۔ ایک تو یوں ہی کالی کلوٹی اور معمولی صورت کی پیدا ہی ہوئی تھی۔ بیماریوں نے اسے اور بھی بدصورت بنا رکھا تھا مگر ماں باپ کو امید تھی کہ جوان ہو کر کچھ نہ کچھ صورت نکھر آئے گی۔ اور بدصورتی دب جائے گی مگر چندرا جیسے جیسے جوان ہوتی گئی اس کی بدصورتی نکھرتی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے بدصورتی کا نمونہ بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ کالا کلوٹا رنگ، چہرے پر چیچک کے بڑے، بڑے چمکیلے داغ، چھوٹی پیشانی، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں۔ موٹے موٹے اور کچھ الٹے ہوئے ہونٹ۔ ایسی لڑکی سے بیاہ کون کرتا، لڑکیوں کا کال تو نہیں۔ بات چلتی اور ختم ہو جاتی۔ تینوں چھوٹی بہنوں کا بیاہ بھی ہوا اور سب کے بچے بھی ہوئے مگر وہ بیٹھی رہی۔ ماں باپ نے تھک کر کوشش کی کہ کوئی عام آدمی یا رنڈوا ہی مل جائے تو اس کا بیاہ ہو جائے۔ انہوں نے روپے کا لالچ بھی دیا مگر کوئی بر ملا ہی نہیں۔ حد تو یہ تھی کہ جگر دھر بابو اس کے باپ کے کلرک تھے اور دن بھر مقدموں کا بستہ اٹھائے پھرتے تھے۔ اس کے باپ کو حضور کہتے کہتے منھ سوکھتا تھا۔ عمر بھی پچاس سال سے کم نہ تھی۔ چار چار بچے تھے۔ ان کی پتنی مر گئی تو اس کے باپ نے خود ہی ان سے کہا مگر انہوں نے بھی بات، بنا کر انکار کر ہی دیا۔

چندرا کو سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے بیاہ کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے غریب اور معمولی گھر کے لڑکے کو ہزاروں تلک اور جہیز دینے کو کہا تھا ہر طرح کا لالچ دیا تھا مگر چندرا کی صورت کیسے بدل دیتے یہ ان کے بس سے باہر بات تھی۔ چندرا خود بھی اسے سمجھتی تھی۔ اسکول سے کالج تک لگاتار کئی برسوں تک وہ ہر روز باہر جایا کرتی تھی اور دیکھتی کہ جوان لڑکے دوسری جوان لڑکیوں کو کن آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اُس کی

ساتھی سومنگلا تھی گوری چٹی اور خوبصورت۔ رکمنی تھی، کھڑے نقشے کی سانولی لڑکی، پربھا تھی، معمولی صورت کی لڑکی۔ ان میں سے کوئی بھی بھرپور جوان نہیں تھی، مگر گھر سے نکلنے کے بعد اسکول کے دروازے تک نوجوانوں کی نگاہیں ان کے قدم چومتی تھیں۔ لیکن اسے کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا تھا، البتہ کئی مرتبہ راستے میں اسکول اور کالج کے لڑکوں نے اس پر پھبتیاں ضرور کسی تھیں۔ ایک دن وہ سومنگلا کے ساتھ اسکول جارہی تھی تو راستے میں کئی لڑکے کھڑے تھے ان میں سے ایک نے کہا تھا "ارے دیکھو، چاند کے ساتھ ساتھ کالی بدلی بھی ہے" اور سارے لڑکے ہنس پڑے تھے۔ اس دن اس کے بدن میں دیر تک چنگاریاں سی چھوٹتی رہی تھیں۔ ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار لڑکوں نے اس پر پھبتیاں کسی تھیں اور اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ ایک دن کالج جارہی تھی تو ایک لڑکے نے سامنے آکر ہاتھ جوڑے، پرنام کیا اور بولا "کالی میا میری پرارتھنا مان لے۔ ایسے مت نکلا کر ہم لوگوں کو ڈر لگتا ہے۔" اس دن وہ خوب روئی تھی اور رنج وغصہ سے کھانا بھی نہیں کھاسکی تھی۔

لیکن جب موہنا کا بچہ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اس کا کلیجہ سچ مچ پھٹ جائے گا۔ وہ موہنا کے کمرے سے چلے جانے کے بعد دیر تک پلنگ پر پڑی روتی رہی۔ یہ تو آخری حد تھی کہ وہ بچے کو پیار کرنے کو بڑھی اور وہ ڈر گیا۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا تو اس نے پھر ناول پڑھنا چاہا مگر جی نہ لگا۔ نہ اسے کامنی یاد رہی تھی نہ اتول اور نہ سمترا۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ موہنا کو پکارے اور اس سے باتیں کرے۔ مگر موہنا خود ہی کمرے میں آگئی اور بولی۔

"بڑا نٹ کھٹ ہے دیدی، میرے سوا کسی کے پاس نہیں رہتا اور کوئی زبردستی لینا چاہے

تو اور رو کر گھر سر پر اٹھا لیتا ہے۔ چندرا موہنا کی بات سن کر مسکرا دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ موہنا اس کا دل رکھنے کو باتیں بنا رہی ہے۔ ورنہ بچہ ہنس مکھ تھا۔ اور اب کمرے سے باہر نانی کی گودی میں گلکاریاں بھر رہا تھا۔ چندرا نے بات ہی بدل دی اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ ایسے اچانک کیسے آ گئیں۔ موہنا نے بتایا کہ اس کی جیٹھانی کسم بہت بیمار ہے۔ اور اس کا پتی گھر کرایہ پر لینے کو آیا ہے۔ کہ وہ آ جائیں اور علاج ہو۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ کسم کی آنت میں زخم ہے اور آپریشن ضروری ہو گیا ہے۔ آپریشن پٹنہ میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ نے پاس والا مکان دے دیا ہے۔ اس کا پتی رات کی گاڑی سے گھر واپس جائے گا۔ اور دوسرے دن شام تک مراری بابو کسم کو لے کر آ جائیں گے۔ پھر علاج ہو گا اور آپریشن ہو گا۔

چندرا کسم کو جانتی تھی۔ دونوں اسکول میں ساتھی تھیں۔ کسم خوبصورت، نیک اور سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ جو دن بھر ذرا ذرا سی بات پر ہنستی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح نہ شور ہنگامہ کرتی تھی اور نہ کسی سے لڑتی تھی اور نہ ہر لڑکی سے زیادہ ملتی تھی۔ عمر میں اس سے چھوٹی تھی مگر دونوں میں دوستی تھی۔ لیکن کالج جانے سے پہلے اس کا بیاہ ہو گیا تھا اور اس لئے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے تو کئی ہوئے تھے، لیکن صرف دو چھوٹے بچے رہ گئے تھے۔ چندرا کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ کسم کو بڑی خطرناک بیماری نے پکڑ لیا ہے۔ علاج آپریشن کے سوا اور کچھ نہیں اور اتنی کمزور ہے کہ آپریشن بھی نہیں ہو سکتا۔ اور آپریشن کسی وقت بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ چندرا کو بہت سی پچھلی باتیں یاد آ گئیں اور یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اگر کسم مر گئی تو اس کے بچوں کا کیا ہو گا۔ مراری بابو کو دوسری پتنی مل جائے گی لیکن بچوں کو ماں کہاں ملے گی۔ زیادہ رنج یہ ہوا کہ بہت سے ناولوں میں اس نے سوتیلی ماؤں کے بارے میں پڑھا تھا اور ایسے واقعات بھی سنے تھے کہ سوتیلی

ماؤں کے آنے کے بعد بچوں کی زندگی کس طرح برباد ہو گئی۔ اس کے دل میں بچوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ جن کے سر پر دُکھ کے بادل منڈلا رہے تھے۔

دوسرے دن مراری بابو کسم اور بچوں کو لے کر آ گئے۔ چندرا اس سے ملنے گئی اور اسے معلوم ہوا کہ مراری بابو بچوں کو لانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر کسم نہ مانی۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ بچے نہیں جائیں گے تو وہ علاج کرانے نہیں جائے گی۔ پہلے دو بچے مر چکے تھے اور وہ موت اور زندگی کی کھینچ تان میں بچوں کو اپنی نظر سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بچوں کو ساتھ لانے کے بعد دوسرا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ مراری بابو کی ماں بوڑھی تھیں اور اوپر کا کام کرنے کے لئے ایک بوڑھی عورت تھی۔ ایک عورت اور بھی تھی۔ مگر بالکل گنوار۔ چندرا جب کسم سے ملی تو اس کو اطمینان دلایا کہ بچوں کی طرف سے مطمئن رہے۔ وہ ضرور دیکھ بھال کرے گی۔ اور بچوں کو تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ کسم نے احسان مند نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اور باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

لو لو اور پوٹو بڑے پیارے بچے تھے بھولے بھالے اور ہنس مکھ۔ کسم نے دونوں کو پاس اور کہا "یہ ماسی ہیں پرنام کرو۔" اور دونوں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ لولو چار سال کا تھا اور پوٹو دو سال کا۔ چندرا نے ذرا چمکارا تو دونوں بچے اس کے پاس آ گئے۔ پوٹو نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چندرا کے چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اور وہ ڈر گئی کہ کہیں یہ لڑکا بھی ڈر کر چیخ نہ اُٹھے مگر پل بھر بعد ہی وہ مسکرا دیا۔ اور توتلی زبان میں بولا "ماچی تم بلی اچھی ہو۔"

اور چندرا کا دل پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ اس نے دونوں بچوں کو سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ اور لولو نے اس کی عینک کو چھوتے ہوئے کہا "ماسی اپنا چشمہ ہم کو دے دو۔"

کسم نے کمزور آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے بچے چشمہ نہیں لگاتے۔"

اور لولو نے عینک چھوڑ دی۔ کسم بولی۔

"ارے تم دونوں نے ماسی کو پیار کیا ہی نہیں۔"

اور دونوں بچوں نے دو طرف چندرا کے گالوں پر اپنے منھ رکھ دیے۔ اور چندرا کو ایسا محسوس ہوا کہ اب تک وہ جس چیز سے محروم تھی۔ وہ اسے مل گئی۔ دونوں بچوں کے لئے اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

چندرا کو خود اپنے دکھ نے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں نظر آتی تھی۔ اور دکھوں کو بھول جانے کے لئے اس نے ناول پڑھنا شروع کیا۔ ناول کو پڑھنے کے بعد زندگی کو نئے نئے پہلوؤں سے دیکھنے اور ان مسئلوں پر نئے ڈھنگ سے سوچنے کا اسے موقع ملا تھا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ غموں پر اختیار حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہشوں کو دل سے نکال دے اور دوسروں کے غم کو اپنا لے۔ دوسروں کے دکھ کو دور کرنے کی کوشش میں آدمی خود اپنے دکھوں کو بھول سکتا ہے۔ اور چندرا نے دوسروں کے دکھوں کو کچھ اس طرح محسوس کرنا شروع کیا کہ خود اپنے غم اسے غم نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہ سوچتی رہتی تھی کہ آخر اسے غم ہی کیا ہے۔ صرف ایک یہ کہ اس کا بیاہ نہیں ہوا مگر اس ایک غم نے اسے بہت سے غموں سے بچا لیا ہے۔ اسے کسم یاد آئی جس کی ہر سانس اسے موت کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اور بچوں کے لئے کسم کی پریشانی۔ اور وہ بے چین ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک غم نے اسے ہزاروں غموں سے بچا لیا ہے اور اپنے غم کو بھول کر اور کسم کے غموں کو اپنا کر بھلا سکتی ہے۔ یوں بھی ناولوں کی دنیا میں کھو کر غم کو بڑی حد تک

بھول چکی تھی۔

چندرا نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ اپنی زندگی دوسروں کے غموں کو دور کرنے میں لگادے اور اس طرح اپنے غم کو بالکل ہی بھول جائے لیکن اس کا موقع بھی نہ تھا۔ کئی بار اس نے سوچا تھا کہ بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے۔ صبح اُٹھ کر ہسپتال جائے اور وہاں کام کرتی رہے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ماں باپ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ باپ شہر کے بہت بڑے وکیل تھے اور یہ کام بہت چھوٹا تھا۔ اگر وہ یہ کام شروع کرتی تو ان کے نام کو بٹہ لگتا۔ اور وہ چُپ چاپ کمرے میں لیٹی لیٹی ناول پڑھتی رہتی اور دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرتی رہتی۔ کسم کی بیماری نے موقع دیا تھا کہ دوسرے کی سیوا کر کے اپنے غم کو بالکل بھول جائے۔

دوسرے ہی دن سے چندرا کی زندگی بدلنے لگی۔ صبح سویرے اٹھ کر کسم کے پاس چلی جاتی۔ دونوں بچوں کو اٹھاتی۔ نہلاتی دھلاتی۔ کپڑے پہناتی۔ ناشتہ کھلاتی۔ تھوڑی دیر کسم کے پاس بیٹھتی اس سے باتیں کرتی، دلاسے دیتی، وقت پر دوا کھلاتی۔ پھر اپنے گھر آجاتی۔ نہا دھو کر ناشتہ کرتی۔ پھر کسم کے پاس چلی جاتی، بچوں کو اپنے پاس بٹھاتی۔ ان سے باتیں کرتی، کہانی سناتی پھر وقت پر کھانا کھلاتی اور ان کو کمرے میں کھیلنے کا سامان دے کر اپنے گھر آجاتی۔ بچے بھی اس کی بات مانتے تھے اور گھوم پھر کر اس کے پاس رہتے تھے۔ کسم پلنگ پر پڑی پڑی سب کچھ دیکھتی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتی۔ وہ شروع سے ہی جانتی تھی کہ چندرا کی شکل جتنی خراب تھی دل اس کا اتنا ہی اچھا تھا۔ اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کچھ نہ تھا۔

چندرا جب بچوں کی طرف سے مطمئن ہو جاتی تو کسم کے پاس آکر بیٹھتی اور گھنٹوں اس سے باتیں کرتی، بچپن کی کہانیاں دہراتی اور اس سے ایسی باتیں کرتی کہ وہ اپنی تکلیف اور بیماری کو بھول

جائے اور کسم کا بھی دل لگ جاتا تھا۔ مراری بابو خوش تھے کہ ایسے وقت میں کسم کی بچپن کی ایک سہیلی مل گئی تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی اور بچوں کا بھی۔ اور ان کے دل میں چندرا کے لئے احسان مندی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تھے کہ یہ عورت ہے یا دیوی جو اس لگن سے کسم اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی ہے۔ اور وہ جتنی بار چندرا کے بارے میں سوچتے ان کے دل میں چندرا کے لئے زیادہ عزت پیدا ہوتی جاتی۔

شام کا وقت تھا۔ چندرا نے بچوں کو ناشتہ کھلا کر دائی کے ساتھ میدان میں بھیج دیا تھا۔ اور خود کسم کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی اور اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اور یقین دلا رہی تھی کہ وہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ مہینوں سے علاج ہو رہا تھا مگر کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ آپریشن کا اس وقت تک سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا جب تک بدن میں طاقت نہ آجائے۔ کسم کو اپنی حالت کا اندازہ تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے چندرا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"چندرا بہن میں تو تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔ اگر زندہ رہ گئی تو ساری زندگی تمہارا احسان سر پہ لئے پھروں گی اور اگر مر گئی تو سر پہ لئے جاؤں گی۔ تمہاری وجہ سے میرے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ چندرا اسے دیر تک سمجھاتی اور یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ اچھی ہو جائے گی اور اسے بچوں کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہئے لیکن کسم دیر تک ایک ہی بات کو دہراتی رہی تھی۔

ساتھ رہنے سے چندرا کو بچوں سے محبت ہو گئی تھی۔ دونوں بچے بھی اس میں لپٹے رہتے

تھے اور کسم کی حالت سدھرنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ علاج جاری رہا لیکن اس کے بدن میں اتنی طاقت ہی پیدا نہ ہوتی تھی کہ آپریشن ہو۔ بلکہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ چندرا کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتی تھی کہ اگر کسم مر گئی تو دونوں بچوں کا کیا ہوگا۔ مراری بابو کی عمر چالیس سال بھی نہ تھی اور صحت اچھی تھی۔ گرہستی کو باقی رکھنے کے لئے بیاہ ضرور کریں گے مگر وہ عورت کیسی ہوگی اور بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ ان بچوں کا کیا ہوگا اور یہ سوچ کر وہ پریشان ہو جاتی تھی۔

ایک دن چندرا اور کسم بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ مراری بابو ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ دونوں بچے چندرا کے پاس کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ دوسرے کمرے میں چل کر کوئی کہانی سنا دے۔ کسم دیکھ کر مسکرا دی اور بولی۔

"چندرا بہن معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں نولو اور پوٹو تمہارے ہی بچے تھے۔ جب ہی تو تم دونوں کے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہو۔ ان سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہو اور یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ ویسے ہی گھل مل گئے ہیں کہ کبھی گھر کے کسی آدمی سے نہیں ملے۔"

چندرا نے دونوں بچوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیا اور پوٹو سے بولی۔

"کہانی رات کو کہی جاتی ہے بدھو مت بنو!"

اور پوٹو اینٹھ گیا تو چندرا بولی۔

"دن کو کہانی کہنے اور سننے سے راہی راہ بھول جاتا ہے اور بیچارے کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔"

نولو بولا۔

"تو پھر ہم ابھی کہانی نہیں سنیں گے۔ جاتے ہیں اپنی موٹر چلانے۔"

اور پوٹو بولا۔

"تو ہم بھی اپنی ریل چلانے جاتے ہیں۔"

اور دونوں بچے سائبان میں بھاگ گئے۔

چندرا مسکرادی۔ واقعی دونوں بچے اتنے گھل مل گئے تھے اسے خود بھی حیرت ہوتی تھی۔ اس کی اپنی بہنوں کے بچے تو اس سے بھاگتے تھے اور یہ دونوں بچے اس سے اتنے گھل مل گئے تھے۔ کسم کا علاج ہو رہا تھا کہ بدن میں طاقت آجائے تو آپریشن ہو مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں بچے چندرا میں الجھتے جا رہے تھے اور اتنے زیادہ گھل مل گئے تھے کہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب کوئی بات ہوتی تو ماسی ماسی پکارتے اور وہ بڑی خوشی سے ان کے کام کرتی۔ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو جانے سے اس کی اداس زندگی میں نئی امنگ پیدا ہو گئی تھی اور وہ دل کے اندر محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کی زندگی بیکار نہیں ہے۔ اس کی اپنی زندگی چاہے جیسی بھی ہو لیکن وہ دوسروں کے کام آسکتی ہے اور سکھی بھی بنا سکتی ہے۔ دوسروں کو خوشی پہنچا سکتی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی اس میں ایک نئی زندگی ابھرنے لگی اور خوشی کا نیا سوتا پھوٹ پڑا۔

گھر پر چندرا کو کوئی کام نہ تھا۔ دن بھر کمرے میں بند ناول پڑھا کرتی تھی۔ کسم کے بچوں میں الجھی تو ان کے پاس رہنے لگی۔ کسم سے باتیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔ جب مراری بابو آجاتے تو ہٹ جاتی اور جب بچے بھی کھیل میں کھوئے رہتے تو موقع نکال کر کچھ دیر پڑھ لیتی۔ اس کے ماں باپ یا گھر کے کسی آدمی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ اس کی زندگی میں

کچھ تو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے بلکہ ایک دن اس کے باپ نے دل بڑھانے کو بڑی تعریف
کی تھی اور کہا تھا۔ اصل دھرم یہی ہے کہ آدمی آدمی کے کام آئے اور سیوا کرے۔ اور چندرا نے
محسوس کیا تھا کہ وہ سچ مچ کوئی بڑا کام کر رہی ہے۔ مگر دوسرے ہی پل اس خیال سے کانپ اٹھی
تھی کہ اگر کسم اچھی نہ ہوئی مر گئی تو ان بچوں کا کیا ہوگا اور وہ کیسے رہیں گے۔ بچے اس سے اتنے
گھل مل گئے تھے کہ انہیں ذرا تکلیف ہوتی تھی تو چندرا کو تکلیف ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتی
کہ ابھی کسم بیمار ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ بچے سامنے ہیں لیکن جب وہ اچھی ہو جائے گی تو گھر چلی
جائے گی۔ بچے بھی چلے جائیں گے۔ پھر کیا ہوگا۔ دل بہلانے کو جو کھلونے مل گئے ہیں وہ چھن
جائیں گے۔ اس وقت کیا کرے گی۔ بچے تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی نظر سے دور ہو جاتے
تھے تو وہ گھبرانے لگتی تھی۔ بچے چلے جائیں گے تو کیا ہوگا، یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

ایک دن چندرا کسم کے پاس بیٹھی تھی۔ بچے سائبان میں کھیل رہے تھے۔ مراری بابو
آ گئے اور باتیں کرنے لگے اور باتوں باتوں میں بولے۔

"چندرا جی آپ تو بچوں سے ایسا پریم کرتی ہیں اور ان کی ایسی سیوا کرتی ہیں کہ کسم
بھی نہ کر سکیں۔ آپ دیوی ہیں جو ایسے کٹھن وقت میں بچوں کو اس طرح پریم دے رہی ہیں۔"

اور یہ کہتے کہتے مراری بابو کی آواز بھرا گئی اور وہ اٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔

ایک دن چندرا بچوں کے ساتھ سائبان میں تھی۔ بچے کھیل رہے تھے اور وہ بیٹھی
ناول دیکھ رہی تھی۔ مراری بابو کسم کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے سنا۔ مراری بابو کہہ رہے تھے۔

"دنیا بھی کیسی عجیب جگہ ہے۔ صورت کو سب دیکھتے۔ دل کو کوئی نہیں دیکھتا۔ صرف
صورت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے چندرا جی کا بیاہ نہ ہوا مگر سوچو۔ جس کا بیاہ چندرا جی سے

ہوتا وہ مرد کتنا بھاگوان اور سکھی ہوتا۔ ایسی دیویاں تو ہر دم دھرتی پر نہیں اترتیں۔"

اور چندرا کے دل میں مراری بابو کے لئے رحم اور عزت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے آدمی ابھی ہیں جو خوبیوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں اور اسے کسم پر رشک آیا تھا۔ کسم کتنی خوش نصیب ہے جو اسے اتنا شریف پتی ملا۔ جب ہی تو اس خراب بیماری میں بھی اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ بدن روز بروز گھلتا جا رہا ہے لیکن چہرے پر رونق ہے اور وہ کس لگن سے اس کا علاج کرا رہے ہیں اور کسی چیز کی فکر ہی نہیں۔ دنیا میں اور کسی چیز سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ اور اس کا دل مراری بابو کی طرف کھنچنے لگا۔

وہ برابر دیکھ رہی تھی کہ جب مراری بابو اور کسم اکیلے میں بیٹھتے تو اس کی باتیں چھیڑ دی جاتیں۔ اور دونوں اس کی تعریف کرتے۔ پھر ایک دن ایسا ہی ہوا، اور مراری بابو اس کی تعریف کرنے لگے کہ دوسرے کمرے میں بیٹھی بیٹھی چندرا کو پسینہ آنے لگا۔ جب وہ چپ ہو جاتے تو کسم اپنی کمزور آواز میں باتیں کرنے لگتی اور اس کی تعریف کرنے لگتی مراری بابو کہہ رہے تھے۔

"صورت کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز آدمی کی اچھائیاں ہیں۔ ایشور کے نزدیک بھی اس کا دام ہے اور آدمی کے نزدیک بھی۔ صورت تو ایک دن مٹ جاتی ہے لیکن اچھائیاں کبھی نہیں مٹتیں اور سدا یاد رہتی ہیں اور چندرا جی میں اتنی اچھائیاں ہیں کہ ان کو گننا بھی مشکل ہے۔"

اور کسم نے کمزور آواز میں کہا تھا۔

"ایک بات کہوں آپ مانیں گے؟"

اور مراری بابو بولے تھے۔

"تمہاری کوئی بات آج تک میں نے اٹھائی ہے؟"

اور کسم بولی تھی۔

"اگر میں مر جاؤں تو آپ چندرا سے بیاہ کر لیجئے گا۔ وہ میری بچپن کی ساتھی ہے اور بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتی ہے۔ میرے بعد ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ کو چندرا سے اچھی پتنی ضرور مل سکتی ہے مگر بچوں کو اس سے اچھی ماں نہیں مل سکتی ہے۔"

مراری بابو نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر کسم نے ان کا ہاتھ ہٹا کر کہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میری پرارتھنا ہے۔"

اور چندرا دیر تک سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ اپنے پتی کو دلاسا دے رہی ہے یا سچ کہہ رہی ہے۔ یا مراری بابو اس کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ پھر کئی دنوں کے بعد کسم نے اس سے کہا تھا۔

"بہن اگر میں مر جاؤں تو میرے بچوں کو اپنے سے الگ نہ کرنا۔ میں ان سے کہوں گی کہ میرے بچوں کو چندرا سے الگ نہ کرنا۔ ورنہ چندرا کا دل ٹوٹ جائے گا اور بچوں کا بھی۔"

اور چندرا نے کسم کو روک دیا تھا اور بولی تھی۔

"تم اچھی ہو رہی ہو۔ تھوڑے دن بعد اور اچھی ہو جاؤ گی۔ بے کار باتیں نہ سوچا کرو۔"

لیکن کسم کی بات سننے کے بعد چندرا مراری بابو کو اپنے سے اور بھی نزدیک محسوس کرنے لگی جو اُسے دیوتا نظر آتے تھے۔ جب ان پر نظر پڑتی تو عقیدت سے اس کی نظر جھک جاتی اور اپنے دل میں کسک سی محسوس کرتی۔ جب وہ اکیلی بیٹھی رہتی تو مراری بابو کے بارے میں گھنٹوں سوچا کرتی۔ کبھی کسی مرد نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا۔ اور اگر دیکھا تھا تو

منھ بنالیا تھا۔ لیکن مراری بابو کو اُس میں اچھائیاں ہی اچھائیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ مراری بابو اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا تو مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے تھے اور دل بڑھانے والی اور ایسی باتیں جن میں حصہ اس کی بڑائی ہوتی۔ کتنی بار چندرا کے دل میں خیال آیا تھا کہ اگر مراری بابو جیسا پتی اسے مل جاتا تو اس کی زندگی ایسی اداس نہ ہوتی۔ اس کے اپنے بچے ہوتے اس کا اپنا گھر ہوتا۔ اطمینان اور خوشی کی زندگی گزارتی۔ کاش مراری بابو پہلے ہی اسے جان لیتے تو اس کی زندگی آج کچھ اور ہوتی۔ اس نے کسم اور مراری بابو کی باتیں بار بار سنی تھی اور جان چکی تھی کہ مراری بابو کے دل میں اس کے لئے بڑی نرم جگہ ہے۔ مگر کبھی ایک پل کے لئے بھی اس کے دل میں یہ بات نہ آئی تھی کہ کسم مرجائے گی اور مراری بابو اُسے اپنا لیں گے۔ جب بھی وہ کسم کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کا رواں رواں دعا کرتا تھا کہ کسم اچھی ہوجائے اور دونوں بچے پھر اس کی محبت پائیں۔

کسم کا علاج ہوتا رہا۔ قیمتی قیمتی دوائیں دی جاتی رہیں کہ بدن میں طاقت آئے اور آپریشن ہو سکے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ زخم اندر ہی اندر بڑھتا ہی گیا۔ کسم کمزور ہوتی گئی اور زندگی کی طرف سے مایوس بھی۔ جب مراری بابو باہر چلے جاتے تو چندرا سے باتیں کرتی اور ہر بار گھوم پھر کر بات ایک ہی جگہ پر آکر رکتی۔ "لولو اور پولو کو نہ چھوڑنا۔" "انھیں اپنے ہی بچے سمجھنا کہ میری آتما کو شانتی ملے" اور کبھی مراری بابو کا خیال رکھنے کو کہتی۔ چندرا اسے سمجھاتی اور دلاسا دیتی اور جیسے دکھوں کے سمندر میں ڈوبنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ اور کبھی کبھی اپنی بے بسی پر رو دیتی۔

کسم کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ایک دن اسے تین بار بے ہوشی کا دورہ پڑا۔ اس دن اسے یقین ہوگیا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ اس نے بچوں کو بار بار بلا کر پیار کیا اور بار بار

چندرا سے وعدہ لیتی رہی کہ اس کے بعد بچوں کو نہیں چھوڑے گی اور اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ دونوں بچے اسے دے کر جا رہی ہے۔ اتنے میں مراری بابو آ گئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ چندرا باہر چلی آئی اور بے چینی کے ساتھ سائبان میں ٹہلتی رہی۔ اس نے کسم کی باتیں سنیں وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ نے بہت لڑائی کی۔ لیکن مجھے موت سے نہیں بچا سکتے۔ میری آخری پرارتھنا ہے"

تھوڑی دیر چپ رہی۔ کمزوری سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر بولی۔

"دیکھئے، بچوں کو چندرا کو دے چکی ہوں۔ اس سے کبھی الگ نہ کیجئے گا۔ بلکہ آپ اس سے بیاہ کر لیجئے گا۔ میں خوش مروں گی۔"

اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔ چندرا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور مراری بابو بڑی مشکل سے بولے تھے۔

"ایشور کی جو مرضی۔"

دوسرے ہی دن کسم مر گئی۔

چار دن بعد مراری بابو گھر لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ گھر کے سارے لوگ اکٹھا تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مراری بابو کی ماں بولیں۔

"مراری تم نے سوچا ہے۔ تمہارے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں بوڑھی ہوں تمہارے تینوں بھائی اپنی اپنی نوکری پر ہیں اور دور دور ہیں۔"

مراری بابو کچھ بھی نہ بولے تو ان کی ماں پھر بولیں۔

"تم نے کچھ سوچا ہے بچوں کو دیکھنے والا کوئی بھی نہیں، تم کو جلد ہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔

یہاں تو چندرا بیٹی نے سنبھال دیا۔ لیکن سدا تو وہ نہیں دیکھ سکے گی۔"

مراری بابو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ بولے۔

"ماں! کسم دونوں بچے چندرا بہن کو دے گئی ہے۔ وہ انہیں کے ساتھ رہیں گے۔ چندرا بہن کے رہتے ہوئے مجھے بچوں کی طرف سے اطمینان ہے۔"

چندرا کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مگر وہ سنبھلی، اُٹھی اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے کمرے کے اندر چلی گئی۔

ساوتری

کتاب، لکھنؤ
خاص نمبر ۱۹۷۲ء

ساوتری

راجیش نے کمرے میں پاؤں رکھا تو اُسے ہر چیز نئی نظر آئی۔ پہلے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کمرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے کے کونے سے ایک گوری چِٹی لڑکی سفید ساڑی پہنے آکر سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور بولی۔

"بیٹھو۔"

راجیش نے فرش کو دیکھا۔ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"پہلے تو اس کمرے میں اینتا رہتی تھی۔"

"ہاں۔"

جواب ملا۔ راجیش نے سوال کر دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ساوتری۔"

راجیش اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ذرا دیر دونوں چُپ رہے۔ ساوتری نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ستیاوان"

راجیش ہنسنے لگا۔ ساوتری بھی مسکرائی۔ راجیش نے پوچھا۔

"نام پسند نہیں آیا۔؟"

"بہت پسند آیا۔"

ساوتری بولی۔ راجیش مسکراتا رہا۔ اس کو اپنا جواب بہت پسند آیا تھا۔ اُسی لہر میں وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"ساوتری کے پاس ستیاوان ہی آسکتا ہے!"

ساوتری ہنسنے لگی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اُٹھے۔ راجیش کے دل کو جھٹکا لگا۔ ساوتری نام ہے۔ اور دیویوں جیسی صورت ہے۔ مگر رہتی ہے سوناگاچی میں۔ ہر پل کسی آنے والے مرد کی راہ دیکھتی رہتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بدن بیچتی ہے۔ وہ سوچتا ہی رہتا۔ مگر ساوتری بولی۔

"اس جگ کی ساوتری بھی جھوٹی اور ستیاوان بھی جھوٹا۔"

راجیش سنبھل گیا۔ ساوتری نے تیز جملہ کہا تھا۔ وہ اس کا منھ دیکھنے لگا۔ ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"برا معلوم ہوا کیا؟"

راجیش مسکرایا اور بولا۔

"کہانی بہت اچھی ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ساوتری اور ستیاوان کبھی تھے بھی یا نہیں؟"

"تم تو کوی معلوم ہوتے ہو۔"

راجیش بولا۔

"میں نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں جو کویتا معلوم ہو۔ میں نے تو سچی بات کہی ہے۔"

ساوتری بولی۔

"سچائی سے بڑی کوئی کویتا نہیں۔"

راجیش کو اندازہ ہوا کہ ساوتری دل چسپ باتیں کرتی ہے۔ وہ بہت سی عورتوں سے ملا تھا۔ مگر اتنی دل چسپ باتیں کسی نے بھی نہیں کی تھیں۔ اس کی آواز میں مٹھاس تھی اور بات کرنے کے انداز میں دل کشی۔ سوناگاچی میں اب تک وہ جتنی لڑکیوں سے ملا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر ترکاری بیچنے والوں کی طرح باتیں کرتی تھیں۔ ہر بات اپنے فائدے کی۔ ساوتری میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ راجیش بولا۔

"تم بہت دل چسپ باتیں کرتی ہو۔"

ساوتری مسکرائی۔ اور بولی۔

"تم کم دل چسپ باتیں نہیں کرتے۔ کرتے کیا ہو۔ کویتا تو کرتے نہیں۔"

ساوتری ہنس پڑی۔ اُس کے دانت پھر چمک اُٹھے — راجیش بولا۔

"مزدور آدمی ہوں۔ دن بھر محنت کرتا ہوں۔ تھک ہار کر ذرا دل بہلانے ادھر آنکلا۔ میرے پاس شاعری کرنے کے لئے وقت کہاں ہے؟"

ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"تو روپیہ کماتے ہو۔ روپیہ کمانا تو سب سے بڑی شاعری ہے۔ روپیہ بڑی من موہنی چیز ہے۔"

راجیش کو محسوس ہوا کہ ساوتری اس پر چوٹ کر گئی۔ وہ بولا۔

"روپیہ کمانا کوئی بڑی بات تو نہیں"۔

ساوتری بولی۔

"میں نے کب یہ کہا۔ میں تو کہتی ہوں کہ روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ روپیہ نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔

ساوتری باتیں کرتی۔ اور ہر جملہ ختم کر کے پلکیں جھپکاتی تو ایسا لگتا کہ جو بات زبان سے نہیں کہہ سکی۔ وہ آنکھوں نے پوری کر دی۔ وہ سوناگاچی میں جتنی لڑکیوں سے ملا تھا۔ ساوتری سب سے مختلف تھی۔ اس کے بستر پر بنگلہ کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ رسالے پڑے تھے۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ وہ خود پڑھا لکھا تھا۔ اور کتابوں سے دل چسپی رکھتا تھا۔ بولا۔

"تمہارے پاس کیسی کتابیں ہیں؟"

ساوتری بولی۔

"ناول ہیں۔ اور فلمی رسالے"۔

راجیش بولا۔

"اسی لئے اتنی دل چسپ باتیں کرتی ہو"۔

ساوتری مسکرائی اور پلکیں جھپکا کر بولی۔

"تم کو میری باتیں دل چسپ معلوم ہوتی ہیں"۔

"ہاں۔ آج کسی لڑکی سے باتیں کرنے کا مزا آ رہا ہے"۔

"شکریہ!"

ساوتری نے کئی بار جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔ راجیش اس کا منہ دیکھتا رہا۔ ساوتری بولی۔

"تم نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کرو"۔

راجیش سوال کر بیٹھا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ساوتری کا مسکراتا ہوا چہرہ میلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے گردن جھکالی اور آہستہ سے بولی۔

"یہ جان کر کیا کروگے؟"

راجیش کو اپنا سوال بے ضرورت معلوم ہوا۔ وہ بولا۔

"بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ تم کو برا معلوم ہوا ہو تو....."

ساوتری بولی۔

"برا کیوں لگے گا۔ سمجھ لو، اسی کمرے میں پیدا ہوئی، اسی کمرے میں...."

راجیش نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں تو انیتا رہتی تھی۔ میں تو اسی کا کمرہ سمجھ کر آگیا تھا۔"

ساوتری بولی۔

"اور انیتا کو نہ پاکر تم کو مایوسی ہوئی۔"

راجیش صفائی کے انداز میں جلدی سے بولا۔

"تم سے مل کر تو بہت خوشی ہوئی۔ آج باتیں کرنے کا کچھ لطف آیا۔ ورنہ...."

ساوتری بات کاٹ کر بولی۔

"یہ تو میرا دل رکھنے کو کہہ رہے ہو۔"

راجیش بولا۔

نہیں ایسی بات نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ مگر انیتا کہاں گئی۔؟"

ساوتری بولی۔

"مجھے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ میں نے انیتا کو دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے کہ وہ اسی کمرے میں رہتی تھی۔ اس نے بیاہ کر لیا۔ اُس کا پتی ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہے۔ اب وہ کسی گاؤں میں رہتی ہے۔"

راجیش بولا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

ساوتری بولی۔

"خوشی کی بات تو ہے۔"

مگر اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا سایہ پھیل کر سمٹ گیا۔

راجیش کو عجیب سا لگا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ ساوتری مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"ذرا چائے بنا لوں۔"

راجیش جلدی سے بولا۔

"میں چائے پی چکا ہوں۔"

ساوتری بولی۔

"میں نے اب تک چائے نہیں پی۔ شام کے وقت نہانے کے بعد چائے ضرور پیتی ہوں۔ چائے بنانے ہی جا رہی تھی کہ تم آ گئے۔ اور تمہاری باتوں میں بھول گئی۔"

ساوتری کمرے کے ایک کونے میں چلی گئی۔ اسٹوو جلا کر کیتلی رکھ کر بولی۔

"پانچ منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی۔ معاف کرنا۔ چائے کی عادت بری ہوتی ہے۔ سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

راجیش ساوتری کو دیکھتا رہا۔ سفید ساڑی میں بیٹھی ہوئی گوری چٹی لڑکی۔ سنگ مرمر کی مورتی جیسی نظر آرہی تھی۔ سر کے بال پیٹھ پر پھیل کر فرش کو چھو رہے تھے۔ اتنے لمبے اور خوبصورت بال اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی یہاں کیسے آگئی۔ ضرور کوئی حادثہ اس کو یہاں لے آیا ہے۔ اسے تو کسی بڑے گھر کی شوبھا ہونا چاہئے تھا۔ یہی جاننے کے لئے تو اس نے سوال کیا تھا کہ گھر کہاں ہے۔ مگر ساوتری نے جواب دیا ہی نہیں۔ دوسری لڑکیاں ایسے سوال کرنے پر جھوٹی سچی لمبی کہانیاں سنا دیتی ہیں۔ اور یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ سیدھے ہمالہ کی چوٹی سے اتر کر اس کے کمرے میں آئی ہیں اور برف کی طرح پاک اور صاف ہیں۔ دوسری لڑکیاں ہر آنے والے سے دروازے پر ہی بھاؤ بتہ کر لیتی ہیں اور روپے وصول کر لینے کے بعد ہی کمرے میں بلاتی ہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ آنے والا جلد سے جلد واپس چلا جائے اور دوسرے آنے والے کے لئے جگہ خالی کر دے۔ بعض لڑکیاں تو پہلے ہی یہ بھی پوچھ لیتی ہیں کہ کتنی دیر ٹھہرنا ہوگا اور اسی حساب سے روپے مانگتی ہیں اور معاملہ طے نہ ہونے پر بے پروائی سے کمرے کے اندر گھس جاتی ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے دوسرا دروازہ دیکھو۔ وقت خراب مت کرو۔ مگر ساوتری میں دوسری لڑکیوں جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جیسے ہی کمرے میں گیا ساوتری مسکرا کر اس سے باتیں کرنے لگی روپے کی بات تک نہیں کی تھی۔ ساوتری نے چائے دان میں پانی انڈیلتے ہوئے راجیش سے پوچھا۔

"کتنی چینی پیتے ہو چائے میں۔"

راجیش نے کہا۔

"چینی نہیں بھی دو گی تو بھی کوئی ہرج نہیں۔"

ساوتری نے پلٹ کر راجیش کو دیکھا۔ اور بولی۔

"کیوں؟"

راجیش مسکرایا اور بولا۔

"تم بناؤ گی تو میٹھی ہو ہی جائے گی۔"

ساوتری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔

"کہتی تھی نا ہیں، تم کوی ہو۔"

اس نے تین پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ ایک پیالی لا کر راجیش کو دی۔ پھر دوسری پیالی اپنے لئے لا کر رکھی۔ اور کمرے سے باہر جا کر اُس نے پکارا۔

"چارو۔"

بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا بھاگا ہوا آیا اور بولا۔

"کیا ہے دیدی؟"

ساوتری بولی۔

"چائے رکھی ہے پی لو۔ اور ہیرا کی دکان سے پان لا دو۔"

چارو نے اسٹوو کے پاس سے چائے کی پیالی اُٹھالی اور چائے پینے لگا۔ راجیش اُسے دیکھتا رہا۔ سیدھا سادہ سانولا سا لڑکا تھا۔ اس نے چائے پی کر پیالی اس جگہ رکھ دی اور باہر چلا گیا۔ راجیش سوچنے لگا۔ یہ لڑکا کون ہے۔ سوناگاچی میں رہنے والی کوئی لڑکی الگ نوکر نہیں رکھتی۔ انیتا، چندرا، کامنی، بینا، نیلما، نونیتا کسی کے پاس نوکر نہیں تھا۔ دو تین آدمی تھے جو ساری لڑکیوں کے لئے کام کرتے تھے۔ ساوتری نے الگ نوکر کیوں رکھا۔ یا یہ بھی سب کا نوکر ہے۔ راجیش

نے پوچھا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟"

ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"میرا بھائی۔"

یقین کرنے کی بات ہی نہیں تھی۔ راجیش ہنسنے لگا۔ ساوتری بولی۔

"یقین نہیں آیا؟"

راجیش بولا۔

"یقین کرنے کی بات ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

ساوتری نے سوال کر دیا۔ راجیش بولا۔

"یقین نہ کرنے کی کئی وجہیں ہیں۔ اور یقین کرنے کی کوئی نہیں۔"

ساوتری سادگی سے بولی۔

"یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ اس میں کیا برائی ہے؟"

"تم کہتی ہو تو یقین کر لیتا ہوں۔"

ساوتری کا اُداس چہرہ دیکھ کر راجیش نے کہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ ساوتری سے جذباتی طور پر قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں چاہت پیدا ہو رہی ہے۔ پہلے کسی لڑکی سے اس نے قربت محسوس نہیں کی تھی۔ اور نہ کسی کے لئے اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پسند آئی تھی اور بس۔ اس کے دماغ سے یہ بات بھی نکل گئی تھی کہ وہ

سوناگاچی کے ایک کمرے میں بیٹھا ہے اور ساوتری بدن کا بیچنے والی لڑکی ہے۔ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا، جیسے کسی دوست سے کوئی باتیں کرتا ہو۔۔ ساوتری بولی۔

"اور چائے چاہئے؟"

نہیں۔ میں چائے پی کر آیا تھا"

ساوتری بولی۔

"میں اپنے لئے دوسری پیالی بنالوں"

اور وہ اٹھ کر کونے میں چلی گئی۔ راجیش اُسے دیکھتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کنول کیچڑ میں گر گیا ہے اور اس کے دل کو چوٹ لگی۔ ساوتری چائے لے کر آئی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ایک گھونٹ پی کر اُس نے پیالی فرش پر رکھ دی اور مسکرا کر بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

راجیش جذباتی ہو گیا۔ ساوتری کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ بولا۔

"تم یہاں کہاں سے آگئیں؟"

راجیش زیادہ نہ بول سکا۔ ساوتری پھر اُداس ہو گئی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیوں جاننا چاہتے ہو۔ کیا کرو گے جان کر۔۔۔؟"

راجیش جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ ساوتری کے چہرے کو تکتا اور بولتا رہا۔

"میں اس محلے میں بار بار آیا ہوں۔ بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں۔ مگر تمہاری جیسی ایک لڑکی نہیں دیکھی۔ میں نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا۔ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔ کسی سے اتنی دلچسپی

ہوئی ہی نہیں۔ مگر۔ مگر۔۔۔"

راجیش چپ ہو گیا۔ ساوتری بولی۔

"اگر میں بتا بھی دوں تو کیا فائدہ؟"

راجیش بولا۔

"مجھے تمہارا یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

ساوتری نے لمبی سانس لی اور بولی۔

"تو اب کہاں جاؤں؟"

راجیش بولا۔

"اپنے گھر۔ ماں باپ کے پاس۔"

ساوتری کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ آواز بھر آگئی۔ اور وہ بولی۔

"نہیں جا سکتی۔ نہیں جا سکتی۔ میں ان لوگوں کے لئے مر چکی ہوں۔ اُن کو معلوم ہے کہ ناؤ بیچ ندی میں ڈوب گئی اور میری لاش بھی نہیں ملی ان سب کو صبر آگیا ہو گا۔ اب چار مہینے کے بعد ان کے سامنے جاؤں گی اور وہ جان لیں گے کہ میں اتنے دنوں تک کہاں رہی تو ان کی زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی اور میں اسے پسند نہیں کر سکتی۔"

راجیش اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ساوتری کو کیسے چپ کرے۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ ایسی بات کیوں کہہ دی۔ چارو پان لے کر آگیا ساوتری نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور اس کے ہاتھ سے پان لے کر بولی۔

"تم جاؤ کھیلو۔"

چارو چلا گیا۔ ساوتری نے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور راجیش کی طرف پان بڑھا کر بولی۔

”لو کھاؤ۔“

راجیش بولا۔

”میں پان نہیں کھاتا۔“

ساوتری مسکرائی اور بولی۔

”کھالو۔ ہمارے ملک کی خاص چیز ہے۔ پان اسی کو دیتے ہیں جس کے لئے دل میں عزت ہوتی ہے۔ یا محبت۔“

راجیش نے ایک پان لے کر منہ میں رکھ لیا۔ ساوتری بولی۔

”انگریزی پڑھ کر ہم لوگ اپنی ساری باتیں بھول گئے ہیں۔ جب کوئی پان بڑھائے تو ایک نہیں دو لیتے ہیں۔“

راجیش نے ساوتری کو دیکھا اور چپ چاپ دوسرا پان اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور بولا۔

”ایک اپنا اور ایک تمہارا حصہ۔“

ساوتری مسکرائی۔ اسی وقت شیلف پر رکھی ٹائم پیس نے بارہ بجائے۔ راجیش کھڑا ہو گیا۔ ساوتری بھی کھڑی ہو گئی۔ راجیش بولا۔

”بارہ بج گئے۔“

ساوتری گھبرائی سی بولی۔

”تو جا رہے ہو؟“

راجیش بولا۔

"ہاں۔ دور جانا ہے اور سویرے ہی کام بھی ہے۔"

ساوتری نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے۔۔؟"

"پارک سرکس۔ ہوٹل روز لینڈ۔ یہاں سے کافی دور ہے۔"

ساوتری اس کا منہ تکنے لگی۔ راجیش کو خیال آیا۔ ساوتری کا سارا وقت اس نے باتوں میں خراب کر دیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"اسے رکھ لو۔"

"کس بات کے؟"

ساوتری بولی۔ اور اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر راجیش نے نوٹ رکھ کر اس کی مٹھی بند کر دی۔ اور بولا۔

"رکھ لو۔ نہیں رکھو گی تو مجھے دکھ ہو گا۔"

ساوتری اسے دیکھتی رہی اور بولی۔

"کل پھر آؤ گے نا۔"

"ضرور"

راجیش نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساوتری سوچنے لگی۔ یہ کیسا آدمی ہے۔ فرش پر اس کی نظر پڑی۔ ایک کارڈ پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ چھپا تھا۔

راجیش کمار اگروال۔

اسٹار منیرلس کمپنی ۔ رانچی ۔

وہ کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے لمبی سانس لی۔ اور کارڈ کو ایک کتاب کی تہہ میں رکھ دیا۔ چارو آگیا۔ وہ بولی۔

"تم کھانا کھالو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔"

اور بستر پر لیٹ گئی اور سوچتی رہی۔ یہ کیسا آدمی ہے اوروں سے مختلف۔ یہاں جو آتا ہے عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ ایک ایک پیسے پر بحث کرتا ہے۔ ایک یہ آدمی ہے۔ آیا۔ باتیں کیں اور سو روپے دے کر چلا گیا۔ آخر یہاں کیوں آیا تھا۔ یہاں تو جو آتا ہے وہ بھوکے کتے کی طرح نوچ کھانا چاہتا ہے۔ شریف آدمی ہے۔ انیتا کی بیاہ کی خبر سن کر خوش ہوا۔ لیکن کل پھر آئے گا۔ پردیسی کا کیا اعتبار۔ یہاں تو جو آتا ہے، وہ جب تک رہتا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ پھر کون کس کو یاد رکھتا ہے مگر یہ اوروں جیسا نہیں ہے۔ ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔

۱۲

راجیش ہوٹل پہنچا تو باہر سناٹا تھا۔ دو تین کمروں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ ایک کمرے سے چند آدمیوں کے بات کرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور کپڑے بدل کر مسہری پر لیٹ رہا۔ اور بیڈ سوئچ دبا کر روشنی بجھادی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ساوتری اس کے ساتھ آگئی ہے۔ اور بیٹھی اس سے باتیں کررہی ہے۔ وہ کبھی کسی عورت سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ ساوتری کے بارے میں بہت سی باتیں سوچنے لگا۔ ساوتری اپنے بارے میں کچھ بتانا کیوں نہیں چاہتی۔ پڑھی لکھی ضرور ہے۔ اس کے بستر پر کتابیں بھی تھیں اور رسالے بھی کتنی سنجیدہ اور زندہ دل ہے۔ باتیں کس طرح

کرتی ہے۔ مگر پھر اس پر ردعمل شروع ہوا۔ کسی عورت میں اتنی دل چسپی لینا ٹھیک نہیں۔ اسی میں لوگ تباہ ہوتے ہیں۔ اور ساوتری کی باتوں میں تو جادو ہے۔ وہ اس کی باتوں میں کھو گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہاں کس نیت سے گیا تھا۔ اس سے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اس میں بربادی بھی ہے اور بے عزتی بھی۔

راجیش نے سو جانے کی کوشش کی۔ دوسرے دن اسے کاروبار کے سلسلے میں کئی آدمیوں سے ملنا تھا۔ بہت سے معاملات سلجھانے تھے۔ مگر نیند نہیں آئی۔ ساوتری بار بار یاد آتی رہی۔ اس کی باتیں یاد آتی رہیں۔ کبھی سوچا کہ رات اسے وہیں گزارنا چاہیے تھی۔ کبھی سوچا کہ اچھا کیا جو چلا آیا۔ اور پھر اس سے نہیں ملے گا۔ ساوتری دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ پہلے بھی کئی بار وہ سوناگاچی جا چکا تھا اور کچھ وقت گزار کر آ گیا تھا۔ اور بھول گیا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ نہ سوناگاچی کی یاد آتی تھی اور نہ اس لڑکی کی۔ مگر ساوتری میں عجیب بات تھی۔ وہ بار بار یاد آ رہی تھی۔ یہ سوچنے کے بعد بھی کہ پھر وہ اس سے نہیں ملے گا' ساوتری یاد آئے جا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے دل میں کسک سی پیدا ہونے لگتی تھی۔ ساوتری اس عورت سے بہت ملتی جلتی تھی جو بیاہ سے پہلے اس کے تصور میں آیا کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی پتنی گوری چٹی ہو گی۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں ہوں گی۔ پیشانی چوڑی ہو گی۔ لمبے لمبے بال ہوں گے۔ موتیوں جیسے دانت ہوں گے اور بڑی ہنس مکھ ہو گی۔ ساوتری میں وہ ساری باتیں تھیں۔ اور اس کی پتنی میں ایک بھی ویسی بات نہیں تھی۔

راجیش پر پھر ردعمل شروع ہوا۔ سوناگاچی میں رہنے والی لڑکیوں کا بھلا کیا۔ ان پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے۔ جن کا کام ہی ہے دوسروں کو پھنسا کر روپے وصول کرنا اور یہ لڑکی پڑھی لکھی اور بہت چالاک ہے۔ رہتی ہے سوناگاچی میں بدن بیچتی ہے اور ساوتری نام بتاتی ہے۔ روپے

کی بات تک نہیں کرتی۔ جو لڑکیاں روپے پیسے کی باتیں کرتی ہیں۔ وہ بیس پچیس سے زیادہ کسی سے بھی وصول نہیں کر پاتیں۔ مگر اس نے سو روپے وصول کر لئے اور وہ بھی اس طرح کہ خود دیئے۔ اس سے بڑی چالاکی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس نے پھر ایک بار فیصلہ کیا۔ بس ایک بار بے وقوف بن چکا تھا۔ اب ساوتری سے کبھی نہیں ملے گا۔

دروازے پر "کھٹ کھٹ" آواز آئی۔ اس نے کمرہ کھول دیا۔ ہوٹل کا بیرا رام غلام بڈ ٹی لے کر آگیا تھا۔ صبح ہوگئی تھی۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ کلی کر کے آیا۔ اور چائے پی کر اسے خیال آیا بہت کام کرنا ہے۔ سارا دن ختم کرنے پر بھی کام ختم نہیں ہو سکے گا۔ ساوتری کو بھول گیا۔ اور کاروبار کی باتیں اس کے دماغ میں آنے لگیں۔ مگر کبھی کبھی ساوتری کا خیال آجاتا تھا۔ جیسے بادل ہٹ جائے اور چاند چمکنے لگے۔

راجیش جب ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔ کنارے میز پر سیٹھ مانک لال مولجی کے ساتھ چندرا بیٹھی ہوئی تھی۔ سیٹھ مانک لال کی کوئلے کی کئی کانیں تھیں۔ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کے بارے میں سن چکا تھا کہ یہ سیٹھ ستر سال کی عمر ہونے پر بھی وہ شراب اور عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور چندرا کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔ مگر راجیش دوسری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے دیکھا بھی نہیں۔ چندرا بالکل دکاندار قسم کی لڑکی تھی۔ روپیہ دو، چیز خرید اور واپس جاؤ۔ اگر چندرا دیکھ بھی لیتی تو اسے ہرگز پہچانتی۔ اور چندرا سے اسے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس لئے ناشتہ ختم کیا اور باہر چلا گیا۔

شام ہوئی تو راجیش ہوٹل واپس نہیں آیا۔ دو ملاقاتیوں کے ساتھ سینما چلا گیا۔

اُس نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ اُسے وحشت اس لئے ہوتی ہے کہ تفریح کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش نہیں کرتا۔ اور سوناگاچی چلا جاتا ہے۔ اگر دلچسپی کی کوئی دوسری صورت نکال لی جائے تو پھر سوناگاچی کا خیال بھی نہ آئے۔ فلم بھی ایسی ہی تھی۔ ایک دولت مند نوجوان بہک کر عورتوں کے بازار میں پہنچ گیا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری عورت کے چکر میں پڑ کر برباد ہو گیا۔ جب ساری دولت ختم ہو گئی اور صحت بھی جاتی رہی تو پھر کسی نے اس سے بات بھی نہ کی۔ جس عورت کے گھر گیا اس نے بے مروتی سے باتیں کیں۔ تو بیوی بچے یاد آئے۔ وہ گھر واپس آیا۔ بچوں نے خوشی منائی، بیوی نے دلاسا دیا۔ اور پھر ایک بار اس نے نئی زندگی شروع کی۔

ساڑھے نو بجے فلم ختم ہوئی۔ فلم دیکھ کر نکلا تو جیسے اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ ساوتری کا خیال آیا۔ مگر اس نے اسے جھٹک دیا۔ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب سوناگاچی نہیں جانا ہے۔ ان عورتوں سے جتنا دور رہا جائے اچھا ہے۔ صبح کے وقت ہوٹل میں چندرا نے اسے دیکھا تھا مگر اسے پہچانا تک نہیں۔ مگر اب اسے کسی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہوٹل پہنچا تو خوش تھا۔ رام غلام نے اسے ایک لفافہ لا کر دیا۔ اس نے کھول کر پڑھا۔ خوب صورت انگریزی حرفوں میں لکھا تھا۔

میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔

ساوتری

رام غلام بولا۔

"شام کے وقت ایک لڑکا دے گیا تھا"

رام غلام چلا گیا۔ راجیش نے خط کو مروڑ کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اُسے

غصہ آگیا۔ ساوتری اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت اور زیادہ چالاک ہے۔ اور شاید اسے بے وقوف سمجھتی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ ہر روز اسے سو روپے ملتے رہیں گے۔ کپڑے بدل کر کمرے کا دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ ساوتری کی اس حرکت پر اُسے غصہ آرہا تھا اور تعجب اس بات پر کہ اسے نام کیسے معلوم ہو گیا۔ اور اپنی غلطی پر بھی غصہ آیا کہ ہوٹل کا نام اس نے کیوں بتا دیا۔ اگر اس نے ہوٹل کا پتہ نہ جانا ہوتا تو پیچھا نہ کرتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ کمزور دل کا آدمی ہے اسے لوٹا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اپنی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ راجیش نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"رام غلام"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ رام غلام کے ساتھ چاروکھڑا تھا۔ رام غلام چلا گیا۔ راجیش چارو کو دیکھ کر گھبرایا بھی اور اسے غصہ بھی آگیا۔ وہ ذرا تیکھا ہو کر بولا۔

"کیا ہے؟"

چارو بولا۔

"دیدی آئی ہے۔ باہر ٹیکسی میں بیٹھی ہے"

راجیش کو بہت غصہ آیا۔ ساوتری سچ مچ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس طرح تو وہ اُسے بدنام کر دے گی۔ ہوٹل کے سارے لوگ اُسے اچھا آدمی سمجھتے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ ڈانٹ کر چارو کو بھگا دے۔ مگر ڈر گیا۔ جو عورت یہاں تک آسکتی ہے وہ اور بھی کوئی تماشہ کھڑا کر سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ خود جا کر ساوتری کو سوناگاچی چھوڑ آئے۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور چارو

کے ساتھ چلا گیا۔ ہوٹل سے باہر ٹیکسی کھڑی تھی اور اس میں ساوتری بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور بولا۔

"واپس چلو"

ٹیکسی چل پڑی۔ راجیش روکھائی سے بولا۔

"تم کو ہوٹل نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہاں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں"

ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"اسی لئے تو میں باہر رہ گئی تھی"۔

اس نے راجیش کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجیش کا سارا غصہ ختم ہو گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ سوناگاچی پہنچ کر اس کے کمرے میں اس سے صاف صاف کہہ دے گا کہ اس کا پیچھا نہ کرے۔ مگر اس کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا اور ٹیکسی سوناگاچی پہنچ گئی۔ چارو ٹیکسی سے اتر کر مکان کے اندر گھس گیا۔ راجیش نے ٹیکسی کا کرایہ دینا چاہا تو ساوتری نے روک دیا۔ کرایہ دے کر آگے بڑھی۔ راجیش اس کے پیچھے بڑھا جیسے وہ خود نہیں جا رہا تھا ساوتری اسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ چارو نے گھر میں جا کر کمرہ کھول دیا۔ بجلی جلا دی تھی۔ راجیش ساوتری کے ساتھ کمرے میں آیا اور چپ چاپ فرش پر بیٹھ گیا۔ ساوتری کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بڑی مہم سر کی ہو۔ راجیش ایسے بیٹھا تھا جیسے مقابلے میں ہار گیا ہو۔ ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"سچ کہو۔ کیوں نہیں آئے تھے؟"

راجیش ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح بولا۔

"سینما میں دیر ہو گئی۔ بہت تھک بھی گیا تھا۔"

ساوتری بولی۔

"تمہارے انتظار میں چائے بھی نہیں پی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

ساوتری اٹھ کر اسٹوو کے پاس چلی گئی۔ اسٹوو جلا کر پانی بھری کیتلی اس پر رکھ کر واپس آئی اور بولی۔

"سوچا تھا کہ سویرے آؤ گے تو سنیما چلیں گے۔ مگر تم آئے ہی نہیں۔"

راجیش سوچنے لگا۔ کیا جواب دے۔ ساوتری بول اٹھی۔

"یہ تو میں جا کر تم کو لے آئی۔ تم تو آتے بھی نہیں۔"

راجیش بولا۔

"تم کو ہوٹل نہیں جانا چاہئے تھا۔"

ساوتری عجیب انداز سے مسکرائی۔ اور بولی۔

"تم بھول گئے۔ ساوتری نے اپنے ستیاوان کے لئے جم راج کا چندر لوک تک پیچھا کیا تھا۔ میں تو ہوٹل کے سامنے تک ہی گئی۔"

وہ مسکرا دی۔

راجیش ساوتری کو تکتا رہا وہ بے بس سا ہو رہا تھا۔ ساوتری شراب کے نشے کی طرح اس کے سارے جسم پر چھائی جا رہی تھی۔ اور وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ جیسے اس کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ راجیش ہار گیا تھا۔ وہ جیت گئی تھی۔ وہ بولی۔

"تم نے شاید غلطی سے ہوٹل کا پتہ بتا دیا تھا اور میں پہنچ گئی ورنہ تم آتے نہیں۔ یہاں سے چلے جاؤ گے تو نہ جانے تم یاد بھی رکھو گے یا نہیں۔"

ساوتری نے جیسے راجیش کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ وہ ساوتری کا چہرہ تکتا رہا۔ ساوتری بولی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔ تم کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ تم نیک اور بھلے آدمی ہو۔ تم میں کوئی بات نہیں، جو عام طور پر اس گلی میں آنے والوں میں ہوتی ہے۔ اور اس لئے ڈر گئی تھی کہ شاید نہ آؤ۔"

راجیش مشکل سے بول سکا۔

"نہ بھی آتا تو تمہارا کیا نقصان تھا؟"

ساوتری بولی۔

"اسے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

راجیش نے ساوتری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ ساوتری کیا کہنا چاہتی ہے۔ وہ بولا۔

"میں نہیں سمجھا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

ساوتری بولی۔

"ایک بات کہوں۔ مانو گے۔ میری بات کا یقین کرو گے؟"

راجیش اس کا منہ تکتا رہا۔ نہ جانے ساوتری کیا کہنے والی تھی۔ ہر لمحہ وہ نیا قدم بڑھا رہی تھی اور اس سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ساوتری بولی۔

"میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ بس جب تک کلکتہ میں رہو ملتے رہو۔"

راجیش جذباتی ہوتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ساوتری کے بارے میں اس نے غلط

سوچا تھا۔ ساوتری یہاں رہنے والی لڑکیوں سے سچ مچ بالکل مختلف ہے۔ اس کے دل میں پھر کرید پیدا ہوئی۔ جانے کہ وہ کون ہے اور یہاں کیسے آگئی۔ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"کیا کہوں تم سے!"

راجیش چپ ہو گیا۔ ساوتری نے اسے غور سے دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

"چائے بنالوں۔ پانی تیار ہو گیا۔"

وہ اسٹوو کے پاس چلی گئی۔ راجیش سوچنے لگا۔ خواہ مخواہ ساوتری کو بدگمان ہونے کا موقع دیا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کیا کہے۔ ساوتری چائے لے کر آگئی۔ ایک پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"زندگی عجیب انجان راہوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور اچانک عجیب عجیب آدمیوں کا سامنا ہو جاتا ہے۔ تم سے کل ہی ایک بار ملاقات ہوئی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ نہ جانے کتنی پرانی ملاقات ہے۔"

راجیش نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ اس کا حلق تر ہوا تو وہ بولا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

ساوتری مسکرائی اور بولی۔

"اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ملاقات کتنے دن تک باقی رہتی ہے۔"

راجیش بولا۔

"ساری زندگی۔"

ساوتری مسکراتی ہوئی بولی۔

"تم بہت سیدھے آدمی ہو آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

راجیش بولا۔

"وہی ہو گا جو ہم تم چاہیں گے۔"

ساوتری ہنسنے لگی۔ راجیش گھبرا کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"تمہاری سادگی پر ہنسی آگئی۔"

راجیش کو ایسا معلوم ہوا کہ ساوتری اس کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ وہ اپنے لفظوں پر زور دے کر بولا۔

"میں بے سمجھے بات نہیں کر رہا ہوں۔"

ساوتری گمبھیر ہو گئی اور بولی۔

"بات ہمیشہ سمجھ بوجھ کر کی جاتی ہے۔ مگر وقت اسے غلط بنا دیتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

راجیش نے چائے کی پیالی فرش پر رکھ دی۔ ساوتری گھبرا گئی اور بولی۔

"غصّہ ہو گئے کیا؟"

"نہیں تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ساوتری مسکرائی۔ اس کی پلکیں جلدی جلدی جھپکیں۔ اُس نے چائے کی پیالی اٹھا کر راجیش کے ہاتھ میں تھما دی اور بولی۔

"کوئی کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔ چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

راجیش بولا۔

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

ساوتری سنجیدگی سے بولی۔

"آدمی آدمی کو سمجھ لے تو کوئی پریشانی ہی نہ ہو۔"

راجیش بولا۔

"تم کو دوسروں کی طرف سے بڑی بدگمانی ہے۔"

ساوتری بولی۔

"شاید تم خوش نصیب یا عقل مند آدمی ہو۔ آدمی کو پہچان لیتے ہو۔"

راجیش ساوتری کا منہ تکتا رہا۔ وہ بولتی رہی۔

"تم نے شاید کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ میں نے ایک آدمی کو سمجھا لیکن غلط دھوکا کھا گئی اور زندگی برباد کر بیٹھی۔"

ساوتری چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ راجیش کچھ بھی نہیں بولا۔ دونوں ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کرتے رہے اور چائے پیتے رہے۔ آخر ساوتری بولی۔

"یہ محلہ بہت بدنام ہے۔ اس محلے میں جتنی لڑکیاں ہیں بدنام ہیں۔ لیکن یقین جانو سب کی سب ناسمجھی کا شکار ہیں۔ سب کی سب فریب کھا کر یہاں پہنچی ہیں۔ ہر لڑکی کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ یہاں کوئی بھی خوش نہیں۔ ہر ایک نقلی چہرہ لگائے ہنستی ہے۔ اور دل میں روتی ہے۔"

راجیش بولا۔

"تم کیا کیا سوچتی ہو۔ تم دوسری لڑکیوں سے......"

ساوتری بول اٹھی۔

"یہ بھی عجیب بات ہے۔ جب سے دنیا قائم ہے مرد اور عورت کا ساتھ ہے۔ مگر مرد نے عورت کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ عورت کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے۔ وہ مرد سے الگ نہیں رہ سکتی اور مرد اسے سمجھتا بھی نہیں۔ وہ اس کے جسم کو دیکھتا ہے مگر دل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

راجیش بول اٹھا۔

"اور عورت؟"

ساوتری بولی۔

"عورت مرد کے دل کو دیکھتی ہے اور اتنا سمجھتی ہے کہ شاید مرد خود بھی نہیں سمجھتا۔ اسی لئے خود کو حوالے کر کے سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔"

راجیش بولا۔

"تم تو فلسفیوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔"

ساوتری بولی۔

"یہ فلسفہ نہیں سچائی ہے۔ روز کی بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم جان بوجھ کر نہیں آئے تھے ٹال گئے تھے۔ مگر میرا دل نہیں مانا۔ صرف اس لئے کہ تم شریف آدمی ہو۔"

راجیش کو اپنی غلطی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ نہ آ کر اس نے ساوتری کو بہت سی باتیں کہنے کا موقع دے دیا۔ وہ بولا۔

"سنو ساوتری میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہارے لئے میرے

دل میں بہت جگہ ہے۔ مجھے تم سے دلچسپی بھی ہے اور ہمدردی بھی۔ اگر میرا بیاہ نہ ہو چکا تو میں تمہاری اب تک کی زندگی کو بھلا کر تم سے بیاہ کر لیتا۔ اب بھی یہ خیال میرے لئے بہت زیادہ تکلیف کا سبب ہے کہ میں تم کو اپنا نہیں بنا سکتا۔ میرا بیاہ ہو چکا ہے۔ میری پتنی ہے میرا بچہ ہے۔ میری پتنی تمہاری جیسی خوبصورت اور عقلمند بھی نہیں لیکن وہ اس خیال ہی سے مر جائے گی کہ میری محبت میں کوئی دوسرا بھی حصہ دار ہے۔ اور میں اس کی موت کا سامان نہیں کر سکتا۔ کل ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ تم سے ملتا رہا۔ تو پھر تم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے جذبات کی قربانی دے سکتا ہوں۔ مگر پتنی کی موت کا سامان نہیں کر سکتا۔ اب سوچو میں کیسی الجھن میں ہوں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔"

ساوتری بولی۔

"پھر سوناگاچی جیسی جگہ کیوں آتے ہو؟"

راجیش جواب دینے کے لئے تیار تھا۔ بولا۔

مرد ہوں، جوان ہوں، تندرست ہوں اور سادھو نہیں ہوں۔ جب پتنی سے زیادہ دنوں تک دور رہتا ہوں تو ——"

ساوتری یکایک ہنسنے لگی۔ راجیش گھبرا گیا۔ بولا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"مردوں کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔"

راجیش کو ایسا لگا کہ ساوتری نے تھپڑ مار دیا۔ وہ تلملا گیا۔ اسے کوئی جواب بن نہیں پڑا ساوتری کا منہ تکتا رہا۔

"میں تمہاری پتنی کو نہیں جانتی۔ مگر جانتی ہوں کہ وہ عورت ہے۔ اس لئے کہہ سکتی ہوں۔ تم چند ہی دن دور رہ کر دوسری عورت کو کھوجنے نکلتے ہو۔ تم اگر ساری زندگی بھی اس سے دور رہو تو وہ کسی دوسرے مرد کا خیال اپنے دل میں نہیں لا سکتی۔"

راجیش سوچ رہا تھا کہ ساوتری نے ایسی باتیں کرنا کہاں سیکھا، ضرور پڑھی لکھی اور اچھے گھر کی لڑکی ہے اور اس لئے اس سے ہمدردی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بولا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر مرد، مرد ہی رہتا ہے۔ میں کمزور آدمی ہوں یہی سمجھ لو۔"

ساوتری بولی۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

راجیش بولا۔

"تم کو کیا معلوم میں کس حال میں ہوں۔"

ساوتری نے راجیش کو دیکھا اور چپ رہی۔ راجیش بھی کچھ نہ بولا۔ یکایک اس کے کانوں میں سسکیوں کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا ساوتری رو رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے ساوتری کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"رونے کی کیا بات ہے؟"

ساوتری روتی رہی۔ راجیش گھبرایا۔ اگر اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ اور دوسرے کمرے میں رہنے والی لڑکیوں نے بھی سن لیا تو کیا کہیں گی۔ وہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟"

ساوتری بولی۔

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

راجیش بے چین سا ہو گیا۔ اس نے ساوتری کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اور بولا۔

"میرا امتحان مت لو۔"

ساوتری الگ ہو گئی۔ اور بولی۔

"مجھے بھی امتحان میں مت ڈالو۔ ایک بار بری طرح فیل ہو چکی ہوں۔"

راجیش بولا۔

"تم مجھے غلط مت سمجھو۔ میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ تم اپنے بارے میں کچھ سوچو۔"

ساوتری نے لمبی سانس لی۔ اور بولی۔

"میں کیا سوچوں۔ اور سوچ کر بھی کیا کروں گی۔"

راجیش بولا۔

"میں تم کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہاں مت رہو۔"

ساوتری کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر پھیل گئے۔ وہ بولی۔

"کہاں جاؤں۔ میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ میں تو کسی بھلے گھر میں نوکری کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں ایک منٹ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

راجیش بولا۔

"مجھے معاف کرنا ساوتری۔ میں زیادہ دیر یہاں رہوں گا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ اور جیب سے روپے نکال کر ساوتری کے ہاتھ میں دیتا ہوا بولا۔

"اسے رکھ لو"

ساوتری نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور بولی۔

"روپے کیوں دیتے ہو؟"

راجیش نے زبردستی روپے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے رکھ لو۔ کام آئیں گے"

ساوتری رونے لگی۔ راجیش بولا۔

"ہمت کرو۔ کہیں بھی چلی جاؤ۔ جہاں جاؤ اور جو کچھ کرو اس کی خبر مجھے ضرور دینا"۔

راجیش کی آواز حلق میں الجھنے لگی۔ اور وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

راجیش رانچی پہنچا تو اس کا دل اور دماغ پریشان تھا۔ اس نے ساوتری سے بے ضرورت باتیں کی تھیں۔ اس کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔ اور اب وہ نہ جانے کہاں جائے گی اور کیا کرے گی۔ کہیں بھی جائے۔ لیکن اب خبر نہیں دے گی۔ اس کو ضرور مایوسی ہوئی ہوگی۔ اور اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اور بے چین سا رہنے لگا۔ مگر اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس نے غلطی کی۔ ساوتری کے رہنے کا کوئی انتظام کلکتہ میں اسے کر دینا چاہیئے تھا۔ اور وہ جب جاتا تو اس کے ساتھ رہتا۔ مگر یہ عجیب بات تھی۔ وہ دو بار اس سے ملا تھا۔ مگر اتنی دیر میں اس نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اسے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ وہ بھول جاتا تھا کہ اس سے کیوں ملنے گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ساوتری سے اتنا نزدیک محسوس کرنے لگا کہ وہ کبھی دور ہونے والی نہ ہو۔ اس کا دل بار بار چاہتا تھا کہ کلکتہ جائے اور دیکھے کہ وہ کس حال

میں ہے۔ مگر کسی ضرورت کے بغیر جانا ناممکن تھا۔ باپ اجازت ہی نہیں دیتا۔

پندرہ دن گزر گئے۔ ساوتری کا کوئی خط نہیں آیا۔ اور وہ زیادہ پریشان رہنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ساوتری ناراض ہے۔ اور اسی لئے اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ وہ کلکتہ سے کہیں جا چکی ہو گی۔ لیکن کہاں۔ یہ کیسے معلوم ہو۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اپنے دوست مانک لاہری سے سارا حال کہہ دے اور اس سے مدد چاہے۔ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کیا سمجھے گا۔ اس کی زندگی بڑی سیدھی سادی اور صاف تھی۔ دو بچے چھوڑ کر پتنی مر گئی تھی۔ تین سال ہو گئے تھے مگر کبھی بہکا نہیں۔ اور بیاہ اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ نئی پتنی اگر بد مزاج نکلی تو بچوں کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ اور وہ مانک لاہری سے مرعوب رہتا تھا۔

ایک دن وہ اپنی کار کھڑی کر کے ایک دکان میں جانا ہی چاہتا تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی "نمشکار" اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چارو تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

"تم۔ یہاں ـــ"

چارو بولا۔

"دیدی آئی ہے۔"

راجیش بھونچکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کی عجیب حالت ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ کہاں تو وہ پریشان تھا کہ ساوتری کہاں گئی؟ اور کہاں وہ رانچی پہنچ گئی تھی۔ اس کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ مگر اب کیا کرے۔ رانچی اور کلکتہ میں بڑا فرق

تھا۔ کلکتہ میں وہ آزاد رہتا تھا۔ وہاں اس کا جاننے والا کوئی نہیں تھا اور کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ دیکھتا رہے کون کیا کرتا ہے۔ مگر رانچی میں قدم قدم پر لوگ ایسے جاننے والے موجود تھے۔ جن لوگوں سے اس کی ملاقات نہیں تھی، وہ بھی جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔ گھر پر ماں باپ تھے۔ پتنی تھی۔ ساوتری سے ملنا سخت مسئلہ تھا۔ پھر بھی وہ بولا۔

"کب آئے؟"

"کل۔"

چارو نے جواب دیا۔

"دیدی اپنی ایک دوست کے ساتھ ٹھہری ہے۔ وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔"

چارو نے سب کچھ بتا دیا۔ راجیش کو فکر ہو گئی۔ کیسے ملنے جائے۔ اسے ساوتری کے رانچی آنے کی خوشی بھی ہوئی۔ اور اس سے ایک نئی پریشانی بھی۔ پھر بھی وہ بولا۔

"شام کے وقت آؤں گا۔"

چارو چلا گیا۔ راجیش کو فکر ہو گئی۔ کیسے ملے وہ مسز گنگولی کے ساتھ ٹھہری تھی۔ اس کی بیٹی اُس کی ساتھی تھی۔ ساوتری وہاں ٹھہری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز گنگولی اور اس کی بیٹی کو اُس کی اب کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ورنہ وہ ان کے یہاں نہیں ٹھہرتی۔ مگر مسز گنگولی سے اس کی ملاقات نہیں تھی۔ وہاں کیسے چلا جائے۔ مسز گنگولی کو شک ہو سکتا ہے۔ وہ بُرا مان سکتی ہے۔

راجیش بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ مانک سے مدد لے۔ مانک بنگالی تھا۔ اور اس کے ساتھ جانے میں بات بن سکتی تھی۔ اس نے مانک سے ساری باتیں کہہ دیں

اور یہ بھی کہہ دیا کہ اسے ساوتری سے کسی اور قسم کی دلچسپی سے زیادہ ہمدردی ہے۔ وہ پڑھی لکھی اور شریف لڑکی ہے اور یقینی طور پر کسی غلطی کا شکار ہو گئی ہے۔ اور وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کی زندگی سدھر جائے۔

اسی شام کو ساوتری سے راجیش کی ملاقات ہو گئی۔ مانک ساوتری سے بہت متاثر ہوا جتنا راجیش۔ وہ اس سے دیر تک ساوتری کی تعریف کرتا رہا۔ اسے اس پر حیرت تھی کہ اتنی عقل مند لڑکی بہک کر سوناگاچی تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ یہ تو دوسروں کو بہکنے سے بچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ راجیش سے بولا۔

"اگر تم کو کوئی خیال نہ ہو تو میں ساوتری سے بیاہ کرنے کو تیار ہوں۔"

راجیش بولا۔

"مجھے تو خوشی ہو گی۔"

مانک نے کہا۔

"مگر یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ تم ہی اس سے باتیں کر سکتے ہو۔ تم ہی اسے میرے بارے میں بتا سکتے ہو۔ تم اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ اس کی موجودہ زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔ تاکہ وہ کبھی خود کو گری ہوئی نہ سمجھے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس میں کسی طرح بھی کم تری کا احساس باقی رہے۔"

راجیش کے سامنے مانک کی نئی تصویر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مانک شریف آدمی ہے، اصول کا آدمی ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس انداز میں بھی سوچ سکتا ہے۔ راجیش نے ساوتری سے باتیں کیں۔ اسے رضامند کرنے میں کچھ دقت بھی ہوئی۔ لیکن وہ رضامند ہو گئی اور

شادی ہوگئی۔

ساوتری کی یہ زندگی نئی تھی بدلی ہوئی۔ راجیش اس کا بیاہ کرا کے بہت خوش تھا۔ مگر پھر اس کے دل میں ایک نئی خلش پیدا ہوگئی۔ اب ساوتری دوسرے کی ہوگئی تھی۔ بس اتنا تھا کہ دوست کی پتنی تھی۔ وہ مانک کے ساتھ جاتا تھا۔ باتیں کرتا تھا، ہنستا بولتا تھا۔ اب بھی اس سے ملتا تھا اور کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

ایک دن راجیش مانک کو ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر پہ پہنچا۔ ساوتری مشین لئے کپڑے کی سلائی میں لگی ہوئی تھی۔ دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ دائی رسوئی گھر میں کام کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ساوتری نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور بیٹھنے کو کرسی لادی۔ راجیش نے پوچھا۔

"مانک کہاں ہے؟"

وہ بولی۔

"پٹنہ گئے دو دن میں واپس آجائیں گے"

راجیش جانے لگا تو بولی۔

"چائے تو پی لو"

راجیش بیٹھ گیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ چائے آئی۔ راجیش نے چائے پی۔ جب وہ جانے لگا، ساوتری بولی۔

"ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہ مانو گے؟"

راجیش ہنس دیا اور بولا۔

"بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔"

ساوتری نے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔

"تم کو میری بات بُری ضرور لگے گی۔ اور دُکھ بھی ہوگا۔"

راجیش ساوتری کو دیکھنے لگا۔ اور بولا۔

"کہو بھی تو ــــ"

ساوتری بولی۔

"تم مجھ سے ملنے مت آیا کرو"

راجیش ساوتری کا منہ تکنے لگا۔ ساوتری نے اسے دیکھا اور بولی۔

"مت آیا کرو۔ جب تم آتے ہو تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ مجھے تم سے کتنی محبّت ہے۔ میں نے بیاہ اس لئے کر لیا کہ ہمیشہ کے لئے تمہاری گھریلو زندگی سے دور ہو جاؤں۔ تمہیں الجھن میں نہ ڈالوں۔ مگر جب تم آتے ہو۔ تمہیں دیکھ لیتی ہوں تو ......"

ساوتری چُپ ہو گئی۔ راجیش بولا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو ــ ؟"

ساوتری بولی۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ اب میں دوسرے کی پتنی ہوں اور اس کو دھوکا دینا نہیں چاہتی۔ ڈرتی ہوں۔ اگر تم آتے رہے تو..."

ساوتری چپ ہو گئی۔ راجیش نے ساوتری کو دیکھا اور ساوتری نے راجیش کو۔ راجیش چپ چاپ اُس کے مکان سے باہر نکل آیا۔

■■

گرم راکھ

محور (دہلی)
۱۹۶۳ء

گرم راکھ

مالی پودا لگاتا ہے۔ زمین کھود کر تھال باندھتا ہے۔ جڑوں میں پانی دیتا ہے۔ تیز ہوا اور دھوپ سے پودے کو بچاتا ہے۔ اور اس کا سارا وقت پودوں کی رکھوالی اور اس فکر میں کٹ جاتا ہے کہ پودا پیڑ بن جائے اور پھل لائے۔ پھر بھی وہ اتنا پریشان نہیں رہتا، جتنا پیڑ میں پھل آجانے پر رہتا ہے۔ مالی کا دھیان گھوم پھر کر پیڑ ہی میں لگا رہتا ہے۔ اور جب پھل رس پر آنے لگتا ہے، تو پھر تو جیسے اس کی آنکھیں پیڑ ہی میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پیڑ کا خیال بھی کم رہ جاتا ہے۔ اسے بس ایک ہی فکر رہ جاتی ہے۔ پھل پیڑ سے اُتار کر مالک کے گھر پہنچا دے۔

رودھیا کا حال بھی مالی جیسا تھا۔ پارو جب تک بچی تھی۔ دن رات اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی وہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے۔ کہیں کھانسی زکام بھی نہ ہو، اچھی رہے اور بڑی ہوتی جائے۔ پھر کوئی اچھا گھر اور اچھا لڑکا مل جائے اور اس کا بیاہ ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ پارو پانچ سال کی ہوئی تو رودھیا نے اچھا گھر اور اچھا لڑکا دیکھ کر اس کا بیاہ کر دیا اور کچھ دیر کے لئے بے فکر سی ہو گئی۔ اب جب جوان ہو گی اور اس کا مرد بھی جوان ہو گا۔ تو گونا کرا کے لے جائے گا۔ گھر بھی اچھا تھا۔ اور لڑکا بھی۔ لڑکے کا باپ کھاتا پیتا کسان تھا۔ اور لڑکا گاؤں کے اسکول

میں پڑھتا تھا۔ لڑکے کے باپ نے کہا تھا کہ وہ اپنے لڑکے کو اونچی پڑھائی کے لئے شہر بھیجے گا
وہ بھی اپنی لڑکی کو پڑھائے۔ زمانہ بدل رہا ہے اور بیاہ کے بعد ردھیا نے پارو کو گاؤں کے
پاٹھ شالے میں بھیج دیا تھا۔ ردھیا جانتی تھی کہ بیٹی کو سسرال کے لائق بنانا اس کا کام ہے کہ پھر
اسے تکلیف نہ ہو۔ اس سے زیادہ ردھیا کو اور چاہیے بھی کیا تھا۔ اس کی چھاتی کا بوجھ ہلکا ہو گیا
تھا، اور اطمینان۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ پارو کی اُٹھان ہر طرح اچھی تھی۔
دل لگا کر پڑھتی تھی اور دل لگا کر گھر کے کام کرتی تھی۔ جو کام نہیں آتا تھا اسے سیکھنے کی کوشش کرتی
تھی۔ لڑکی کہا مانے اور سگھڑ بنے تو ماں کو اور کیا چاہیے۔

لیکن پارو جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی ردھیا کو فکر نے پھر گھیرنا شروع کر دیا۔ بارہ سال
کی ہو گئی تو اس نے پاٹھ شالے سے اٹھا لیا۔ اور بولی کہ بہت ہوا۔ اب زیادہ پڑھ کر کیا کرے گی۔
اور اس کی آنکھیں پارو کا پیچھا کرنے لگیں۔ وہ کیسے رہتی ہے کیسے اُٹھتی بیٹھتی ہے۔ کیسے آنچل رکھتی
ہے اور کیسے ہنستی بولتی ہے۔ کس کس سے ملتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ کہاں جاتی ہے۔ اور کیوں جاتی ہے۔
ہر وقت اس ٹوہ میں رہتی کہ لڑکی کا کوئی قدم غلط تو نہیں اُٹھ رہا ہے۔ یا اور کوئی ایسی بات تو نہیں
کہ غلط قدم اُٹھنے کا خطرہ ہو۔ پارو میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ بے کار ہی اتنی
فکر مند ہے۔ مگر پھر سب کچھ بھول جاتی۔ اور ہر وقت چوکنا سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ لڑکی پر جوانی
آنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ جیسے رس پر آئے ہوئے پھل کو دیکھ کر اچھے بھلے آدمیوں کے منہ
میں پانی آجاتا ہے اور نیت ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جوان لڑکی کو دیکھ کر نوجوان اور
جوان ایک طرف۔ ادھیڑ عمر کے آدمیوں کی آنکھوں میں بھی شیطان ناچنے لگتا ہے۔ وہ خود بھی اس
راہ سے گذر چکی تھی۔ اور اسے یاد تھا کہ اسے دیکھ کر کن کن لوگوں کی آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں۔ ہونٹ

تھرانے لگتے تھے۔ اور چہرے کا رنگ بدلنے لگتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس کی ماں نے ایک بار کہا تھا۔ جہاں کوئی جوان لڑکی ہوتی ہے وہاں شیطان منڈلاتا رہتا ہے۔ اور نوجوانوں کو کھینچ لاتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ گاؤں کے مندر کے پجاری پنڈت ہرویر ناتھ اس پر بڑے مہربان ہو گئے تھے۔ بچپن میں جب پرساد مانگنے جاتی تھی تو تھوڑا سا پرساد دے کر بھگا دیتے تھے۔ اور دوبارہ مانگنے پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چودہ سال کی ہو گئی تھی اور مندر جاتی تھی تو زیادہ پرساد دیتے تھے۔ اور دوبارہ مانگنے پر پرساد تو دیتے ہی تھے ساتھ ہی کبھی اس کے سر پر اور کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اشیرباد بھی دیا کرتے تھے۔ "ایشور تجھے سُکھی رکھے۔" لیکن اشیرباد دیتے وقت ان کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور چہرے کا رنگ اُڑ سا جاتا تھا۔ اور وہ اسے اسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے وہ ہفتوں کے بھوکے ہوں۔ اور وہ ان کے سامنے لڈو بھرا استھال ہو۔ حالاں کہ پنڈت جی کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان کی دونوں بیٹیاں عمر میں اس سے کئی کئی سال بڑی تھیں۔ اور پنڈت جی کی نیکی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو ان سے کسی کو کوئی شکایت ہوتی ہو۔ ان کو مندر اور اپنے گھر کے سوا اور کسی چیز سے مطلب نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پنڈت جی اتنے مہربان کیوں ہیں۔ مگر ایک دن اس کی ایک سہیلی نے یہ بات اسے سمجھا دی تھی۔ اور اس نے مندر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ردھیا کا بیاہ اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ پانچ سال کی تھی۔ اس وقت اس کے لئے بیاہ کا مطلب لال کپڑا، ڈھول باجا اور دولہا تھا۔ اسے اپنے اور دوسری لڑکیوں کے بیاہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بس اتنا کہ اپنے بیاہ میں لال کپڑے اس نے پہنے تھے۔ اور دوسروں کے بیاہ صرف تماشا دیکھنے کو ملا تھا۔ مگر جیسے جیسے

بڑی ہوتی گئی تھی، بیاہ کا مطلب سمجھتی گئی تھی۔ اور ایک وقت ایسا آیا تھا جب اس پر نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے جھجک اٹھتی تھی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر عجیب سی کیفیت محسوس کرتی اور کبھی کبھی یہ کہ اس میں کوئی کمی ہے۔ اسے کچھ چاہئے جو نہیں مل رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ اس کا جی بہت سی باتیں چاہنے لگتا تھا۔ کوئی اسے دیکھے۔ اس سے ہنس کر باتیں کرے۔ اور وہ بھی ہنس کر جواب دے۔ کبھی کبھی جیسے ہنسی اور خوشی اس کے دل کے اندر سے پھوٹ کر ابلنے لگتی اور اس کا جی چاہتا کہ کوئی اسے چھیڑے اور ایسی باتیں کرے جسے اس کا دل سننا چاہے مگر وہ سن کر ڈانٹ دے۔ اور جواب نہ دے سکے۔ اور وہ خود شرما جاتی۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ انگ انگ مچل رہا ہے۔

اور ایسے وقت میں اس کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی بوٹی بوٹی کو دبائے اور ایسے دبائے کہ اس کا بدن دکھنے لگے۔ کوئی اس سے اپنے دل کی بات کہے اور وہ کسی سے اپنے دل کی بات کہے اور بات لمبی ہوتی چلی جائے۔ کبھی کبھی اپنے دل کے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ اور یہ نہیں سمجھ سکتی کہ یہ بے چینی کیوں ہے، اس کا دل کیا چاہتا ہے۔ اس وقت اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس سے پیار کی باتیں کرے۔ ایسی ہی حالت میں ایک دن اس کی سہیلی پھولو نے پیچھے سے چپ چاپ آکر اسے دبوچ لیا تھا۔ اور اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بار بار کوئی اس کو اسی طرح دبوچتا رہے اور جب پھولو کا گونا ہوا تھا اور وہ لوٹ کر سسرال سے آئی تھی تو اس نے پھولو سے ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھی تھی۔ اور پھولو کی باتیں سن کر اسے بڑا مزا آیا تھا۔ کئی دن تک اس کا جی یہی چاہتا رہا تھا کہ اب اس کا گونا بھی ہو جانا چاہئے۔ اور اس کو اپنے مرد سے ملنا چاہئے۔ اور اس کے بعد اس کی نگاہیں ہر مرد پر جھوم کر پڑتی تھیں۔

اور وہ یہ غور کرنے لگی تھی کہ کون اُسے دیکھتا ہے اور کون نہیں۔ اگر کوئی مرد اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تو اسے جیسے غصہ سا آجاتا۔ اور اگر کوئی سمٹی سمٹائی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ اور اس کا دل جیسے پانی کے دھارے پر کنول کی طرح بہنے لگتا۔ اور کچھ دنوں تک وہ اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبی رہی کہ یہ بھی خیال نہیں رہا کہ پاؤں کہاں پڑ رہا ہے۔ کئی بار تو وہ پھسلتے پھسلتے اور گرتے گرتے بچی۔ بس کسی طرح وہ بچ گئی۔ گری نہیں۔ ورنہ پھسلنے اور گرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ گھر کے سارے لوگ کھا پی کر سونے والے تھے کہ باہر سے آکر بھائی نے کہا کہ ایک راہی آگیا ہے اور اس کے کھانے کے لئے کچھ چاہیئے۔ راہی جو راہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ اور اس کا گاؤں ابھی چھ میل دور تھا۔ راستے میں دو ندیاں ملتی تھیں۔ اور راستہ بھی سنسان تھا اور اس کے دروازے پر ٹھہرنے کو آگیا تھا۔ گاؤں کے لوگ ایسے اچانک آنے والے راہیوں کی خاطر کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور اس کے بھائی نے جلدی سے کھانا تیار کرنے کو کہا تھا۔ کھانا تھوڑی دیر میں تیار ہو گیا تھا۔ اور رودھیا نے کھانا دیتے وقت دیکھا تھا کہ راہی خوب صورت نوجوان تھا۔ عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ رودھیا کے بھائی نے بات چھیڑ دی تھی۔ کہ بے وقت کیسے آنا ہوا۔ اور نوجوان نے بتایا تھا کہ اُسے چھٹی دیر کر کے ملی ہے اور وہ بھاگم بھاگ گھر جا رہا ہے۔ دو دن بعد اس کا گونا ہونے والا ہے۔

اُس رات رودھیا کو نیند نہیں آئی تھی۔ اور وہ سوچتی رہی تھی کہ ایک نوجوان یہ ہے جو گونا کرانے کے لئے بھاگم بھاگ گھر جا رہا ہے۔ اور ایک اس کا مرد ہے جو کلکتہ سے گھر لوٹنے

کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس کی ماں نے بلا بھیجا تھا۔ تو اس نے لکھ بھیجا تھا کہ دو سال اور نہیں آ سکتا۔
ماں خط لکھوا کر تھک گئی کہ آکر گونا کرالے۔ مگر وہ برابر ایک ہی جواب دیتا کہ ابھی دو سال اور
نہیں آئے گا۔ اتنا روپیہ کمائے گا کہ مہاجن سے کھیت چھڑا لے اور بہن کا گونا کر سکے۔ اور اس کا
دل جیسے اُبل پڑا تھا۔ یہ کیسا آدمی ہے جسے کھیت کی فکر ہے، بہن کے گونے کی فکر ہے۔ مگر اپنی
عورت کی فکر نہیں۔ جس کا ایک ایک پل اس کے انتظار میں کٹ رہا ہے۔ ایک نوجوان یہ
ہے کہ جو بھاگم بھاگ گونا کرانے جا رہا ہے۔ مزا لے کر گونے کی باتیں کر رہا ہے۔ اور ایک
اس کا مرد ہے۔ مرے دل کا آدمی جو بار بار بلانے پر بھی آنے کو تیار نہیں۔ جب رودھیا نے
اس کے سامنے کھانا رکھا تھا تو نوجوان نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ ایسی نظروں
سے جس کی پیاس رودھیا کو تھی اور رودھیا کو نوجوان کا اس طرح دیکھنا بہت اچھا لگا تھا۔ اور
وہ پلنگ پر پڑی پڑی اس نوجوان کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی۔ اس کا گورا چٹا رنگ،
گٹھا ہوا بدن اور تمتما ہوا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھوم جاتا تھا۔ اور رودھیا نے سوچا تھا
کیسا آدمی ہے۔ اپنی عورت اسے کتنی پیاری ہے۔ اسے گونا کرا کے لانے کی کتنی بے چینی ہے۔
جو رات ہی کو چل پڑا۔ اور اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ اس کا مرد بھی اسی طرح اس کے لئے
بے چین ہوتا۔ بیاہ ہوئے اتنے دن ہو چکے تھے کہ اُسے مرد کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ نہ
جانے اب وہ کیسا ہے۔ اس کی صورت شکل کیسی ہے۔ وہ بھی اس نوجوان کی طرح ہٹا کٹا اور
مضبوط ہے یا چمپا کے مرد کی طرح بیمار اور مریل۔ اور اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ اگر اس کا مرد
بھی چمپا کے مرد کی طرح مریل اور کمزور ہوا تو پھر کیا ہو گا۔ اور ایک بار اس کا جی چاہا تھا کہ نوجوان
اُسے ساتھ لے جاتا۔ اس نے سوچ لیا کہ سارے لوگ سو جائیں تو نوجوان کے پاس جائے گی اور

کہے گی مجھے ساتھ لے چلو۔ مگر اس کا باپ دیر تک جاگتا اور کھانستا رہا تھا۔ اور خود سوچتے سوچتے اس کو نیند آ گئی تھی۔ اور جب اُٹھ کر باہر جھانک کر دیکھا تو نوجوان جا چکا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی دنوں تک اس نوجوان کی یاد اُس کے دل میں مچلتی رہی تھی۔

دوسری بار جب اس کی چچیری بہن رکھیا کا مرد کلکتہ سے آ کر ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ اس کی بہن بیمار تھی اور ڈاکٹروں نے رائے دی تھی کہ اسے گاؤں لے جاؤ۔ اور وہ اسے لے کر چلا آیا تھا۔ اس بہنوئی کو اس وقت اس نے دیکھا تھا جب چھوٹی تھی۔ اور جب رکھیا کا گونا ہوا تھا تو وہ اپنے نانی کے گھر گئی تھی۔ اب دو سال کے بعد وہ پتنی کو لے کر آیا تھا۔ اور جوانی رادھیا پر ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح جھوم کر آئی تھی۔ اور اس پر ہر وقت نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ اس کے بہنوئی کی ہر بات گاؤں کے ہر مرد سے الگ تھی۔ صاف کپڑے۔ سر میں تیل سے چمکتے ہوئے انگریزی بال۔ مانگ نکلی ہوئی۔ منہ میں پان اور بار بار بیڑی پینا۔ علاج پر روپیہ خرچ کرنا اور بڑی بڑی باتیں کرنا۔ ایسی باتیں کہ گاؤں کے زمین دار بابو گوبردھن سنگھ بھی ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اتنے صاف ستھرے رہتے تھے۔ روپے پیسے کی باتیں اس طرح کرتا تھا جیسے مٹی اور دھول کی۔ جیسے روپے کی اس کے پاس نہ کمی تھی اور نہ کوئی قیمت۔ اور بار بار اس کا زور سے ہنسنا رادھیا کو بہت اچھا لگتا تھا۔ رنگ تو اس کا سانولا تھا، مگر چہرے میں کشش تھی۔ اور باتیں اتنی دلچسپ کرتا تھا کہ رادھیا کا دل چاہتا تھا کہ سنتی ہی رہے۔ رادھیا جب بہن کو دیکھنے جاتی تو اس کا بہنوئی کلکتہ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ وہاں بڑے بڑے اور اونچے اونچے مکان ہیں۔ موٹر ہیں، ٹرام ہیں۔ بڑے بڑے بازار ہیں۔ سنیما گھر ہیں۔ جن میں تماشے دکھائے جاتے ہیں اور ان تماشوں میں لڑکے اور لڑکیاں پریم کرتے ہیں۔ یہ پریم کبھی سپھل ہوتا ہے اور کبھی اسپھل۔ سنیما کی

تصویریں آدمیوں کی طرح چلتی پھرتی اور بولتی ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ بھی بتا دیتا کہ تماشے میں پریم کیسے ہوتا ہے۔ کس طرح جوان لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ کس طرح اس کے گالوں کو چھوتا ہے، اور کس طرح سینے سے لگا لیتا ہے۔ اور ردھیا کی سانس رُکنے لگتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اسی طرح اسے سینے سے لگائے رہے۔ اور کبھی الگ نہ کرے اور وہ خود پگھل کر اس کی گود میں پھیل جائے۔ اور اس نے کئی بار اپنے آپ کو بہنوئی کی گود میں ڈال دیا۔ مگر ہر بار کسی نے اسے پکار لیا۔ یا اور کوئی دُکھیا کو دیکھنے آ گیا۔ اور وہ جھنجھلا کر الگ ہو گئی۔ اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ مگر یہ محسوس کرنے لگی کہ بہنوئی سے الگ نہیں رہ سکتی۔ وہ کبھی سوچتی کہ کلکتہ جادو کا شہر ہے۔ اور اس کا بہنوئی اس شہر کا شہزادہ۔ اور وہ کسی دن اسے ضرور اس جادو کے شہر میں لے جائے گا۔ لیکن دُکھیا اچھی ہو گئی اور اس کا بہنوئی کلکتہ لوٹ گیا مگر اس پر جادو کر گیا۔ اس کا دل ہر وقت کلکتہ میں رہتا۔ بے چین بے چین سا۔

دوسرے ہی سال اس کا گونا ہو گیا۔ اور وہ اپنی سسرال چلی آئی۔ جب گونا ہوا تھا تو وہ بہنوئی کو یاد کر کے خوب روئی تھی۔ اس کا دل سسرال کے بدلے کلکتہ جانے کو چاہتا تھا مگر اسے سسرال جانا پڑا۔ اور نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کا مرد بھولا، اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ وہ ایک ہی دن میں بہنوئی اور کلکتہ کو بھول گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ پہلی ساری باتیں جھوٹی تھیں۔ اور اب جو ہے وہ سچ ہے۔ اس کا مرد نیک اور خوب صورت جوان تھا۔ اور بوڑھی ساس ماں کی طرح پیار کرنے والی۔ چھوٹی نند بہن کی طرح لپٹی رہنے والی۔ اس کی ساس کا ایک بوڑھا بھائی جو صرف بہن اور بہن کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنا گھر بچوں کے حوالے کر کے چلا آیا تھا۔ گونا کے بعد اس کا مرد پھر کلکتہ بھی نہیں گیا۔ اور جانے کی اسے ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

کھیت مہاجن سے چھوٹ چکے تھے۔ اور بہن کے گونا کی بات پکی ہو چکی تھی۔ ماں کی صحت گر چکی تھی۔ اور بیوی سے محبت بہت زیادہ تھی۔ گاؤں میں بھی اِدھر اُدھر نہیں جاتا تھا۔ بس کام گیا اور سیدھا گھر بڑھیا کے پاس۔ گھر اور اس کی فکر، ساس جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اور دو بچوں کو چھاتی سے لگائے زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس کی نیکی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ اس نے بڑھیا اور اپنی بیٹی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ بڑھیا نے اپنے گاؤں میں ساس بہوؤں کے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ لیکن اس کی ساس تو ماں سے بھی کچھ زیادہ محبت کرتی تھی۔ اور بھولا اس کا مرد تو صرف اسی کے لئے تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتی تھی کہ کوئی اور مرد بھی اس کی طرح اپنی عورت سے پیار کرتا ہوگا۔ اس نے گاؤں میں دیکھا تھا، مرد کس طرح اپنی عورتوں کو ڈانٹتے اور مارتے ہیں۔ کس طرح ستاتے ہیں۔ اور کس طرح دُکھ دیتے ہیں۔ مگر اس کا مرد تو بغیر مسکرائے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بس اس کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اُٹھتا تھا۔ اور جب اس کی ماں کی بیماری کی خبر آئی تھی اور وہ رونے لگی تھی تو اس کا مرد اسے سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگا تھا۔ اور دوسرے ہی دن اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا تھا اور کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی تھی۔ کبھی کبھی بڑھیا سوچنے لگتی تھی کہ سچ مچ پنڈت جی کا اشیرباد ہی تو نہیں۔ اور اس کے ساتھ اسے ساری باتیں یاد آجاتیں۔ اور اس کا دل خوشی سے جھوم اُٹھتا۔ پھر وہ پنڈت جی کی باتیں یاد کر کے مسکرانے لگتی۔ اور سوچتی وہ سچ مچ دنیا کی سب سے سُکھی عورت ہے۔

لیکن زندگی کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا جلتے چراغ کو بجھا کر گھر کو اندھیرا کر دیتا ہے۔ اس کے گونا کو کُل دو سال ہوئے تھے۔ اور نند بھی گونا ہو کر سسرال جا چکی تھی۔ اور پارو دو مہینے کی گود میں تھی۔ یکایک گاؤں میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ اور اس کا مرد رات بھر بیمار رہ کر

اس دنیا سے چل بسا۔ ردھیا کی زندگی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اس جھٹکے کو سہار نہ سکے گی۔ رہ رہ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ نہ جانے وہ کہاں چلی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی اکارت ہے۔ جتنی جلدی ختم ہو جائے اچھا ہے۔ پھر ایک بار اس کی ساس نے سہارا دیا۔ بولی، بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہوا، اب اس کی نشانی اس ننھی سی جان کا تو خیال کرو۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو اس ننھی سی جان کا کیا ہوگا۔ اور یکایک جیسے ردھیا کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پارو اس کی امیدوں کی ننھی کرن بن کر دل میں اتر گئی۔ اس میں نئی زندگی آگئی اور اس نے طے کر لیا کہ جو بھی دل پہ گذرے وہ بچی کو پال کر جوان کرے گی۔ اس کا بیاہ کرے گی۔ اور پھر اس سارے روتے ہوئے گھر کو ہنسی خوشی کا گھر بنائے گی۔ اس کی ساس نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ بھی پانچ سال سہاگن رہ کر بیوہ ہو گئی تھی۔ مگر اس نے ہمت کر کے بچوں کو پالا تھا۔ سب کا بیاہ کیا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔ وہ ہمت نہ کرے گی تو نہ بچی زندہ رہے گی اور نہ بوڑھی ساس۔ اور چند ہی دنوں میں اس نے ہر بات کو جھٹک کر اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔ ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا تھا۔ سو بڑھیوں میں ایک بوڑھی بن کر رہ گئی تھی۔ دن رات کھیت گھر اور بچی میں الجھی رہتی۔ اس کے علاوہ اس نے ہر خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکا ــــــ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ حد تو یہ کہ مر جانے کی خواہش کو بھی جو مرد کے مرنے کے بعد اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ جب تک جاگتی رہتی کام کرتی رہتی اور جب سونے جاتی تو سوچ کر کے کہ دوسرے دن اٹھ کر اسے کیا کیا کرنا ہے۔

مرد کے مرتے ہی ردھیا نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ ماں باپ بھی آئے تھے اور دوسرے ناطے والے بھی اور سب نے ایک ہی رائے دی تھی کہ ماں باپ

کے گھر چلی جائے۔ اور کچھ دنوں کے بعد دوسرا بیاہ کر لے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ سترہ سال کی اور ساری زندگی باقی تھی۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ جیتے جی اس ڈیوڑھی کو نہیں چھوڑے گی۔ مرنے والے کا نام نہیں مٹنے دے گی۔ ماں باپ کی باتوں سے اسے دلی رنج پہنچا تھا۔ اور اس کی باتوں سے ماں باپ کو۔ اور وہ چلے گئے تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد ایک ہی رہ گیا تھا۔ پتی پریم کی یادگار بچی پارو کی دیکھ بھال، پالن پوسن، بیاہ اور اس کی خوشی۔ سب نے اسے ایک ہی رائے دی تھی۔ مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی رائے پر قائم رہی۔ اس کا کلکتہ والا بہنوئی بھی آیا جس کی باتیں سن کر وہ جادو کی دنیا میں کھو جاتی تھی۔ اس کی پتنی دکھیا مر چکی تھی۔ اور دو بچے تھے۔ اس نے بھی کہا کہ پہاڑ جیسی زندگی اکیلے کیسے کاٹے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس سے بیاہ کرنے کو تیار ہے۔ مگر دھیا نے اسے سوکھا سا جواب دیا تھا۔ وہ تو پتی کی چتا پر جل مرنے کو تیار تھی۔ مگر بچی کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ اب دوسرا بیاہ نہیں کرے گی۔ اس کی آتما کو دکھ نہیں پہنچائے گی۔ گھر کی مریادا کو مٹنے نہیں دے گی۔ مرنے والے کی یاد کی آگ میں ساری زندگی جلتی رہے گی۔ مگر پتی کے پریم اور گھر کے مریادا کو نہیں جلائے گی۔ پہاڑ چاہے اپنی جگہ سے ہٹ جائے مگر وہ نہیں ہٹے گی۔ اور وہ کر دکھا دے گی۔ عورت اتنی کمزور نہیں، جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اس کی ساس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اب کرے گی۔ ایک پل کے لئے اس کے قدم کبھی نہیں ہلے۔ اس نے کڑی محنت بھی کی۔ پارو کو بھی پال لیا۔ بیاہ بھی کر دیا۔ اور پڑھایا لکھایا بھی۔ بوڑھی ساس کی ماں کی طرح خدمت کی۔ اور اس طرح کہ کبھی یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ بیٹا مر گیا تو بہو نے خیال نہیں کیا۔ بلکہ ساس سب سے یہی کہتی کہ بیٹا اور بیٹی بھی اس کی اتنی سیوا نہ کرتے۔ اور گاؤں والے سب اس کی ایسی ہی تعریف کرتے جیسے اس کی ساس کی۔

لیکن پارو جیسے جیسے جوان ہوتی گئی رودھیا جیسے نیند سے چونکتی گئی۔ اب اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب تک نشے میں تھی۔ بیٹی ساس اور گھر کے سوا اسے اور کسی بات کا خیال ہی نہ تھا۔ مگر پارو کی جوانی نے اس کا نشہ ختم کر دیا تھا۔ اور بہت سے خیالوں کے بھوت اس کے چاروں طرف ہر وقت منڈلانے لگے تھے۔ اس کی نظر چوبیس گھنٹے پارو پر رہتی۔ جب وہ کسی کے گھر جاتی تو اسے ساتھ لے جاتی۔ اور جب پارو کہیں جانے کو کہتی تو خود اس کے ساتھ جاتی۔ جب دو چار لڑکیاں گھر میں آجاتیں اور پارو ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی۔ تو رودھیا کاموں میں لگی رہنے پر بھی کان اسی طرف رکھتی۔ یہ لڑکیاں کیا باتیں کرتی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ رشتے کا بھی کوئی مرد آجاتا اور پارو سے باتیں کرتا تو رودھیا اس کے پاس پہنچ جاتی۔ اور کوئی بات نکال کر خود باتیں کرنے لگتی۔ ہر وقت رودھیا کو ایک ہی خیال رہتا کہ پارو کا گونا ہو جائے اور وہ اپنے گھر پہنچ جائے۔ پھر اسے اطمینان ہو۔ اسے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا کہ آنگن میں رس بھرے پھل والا پیڑ ہے اور چور اُس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ پارو سیدھی سادی اور اچھی لڑکی ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ذرا بھی پریشانی ہو۔ وہ بھی دن بھر ماں کے ساتھ کاموں میں الجھی رہتی تھی۔ مگر رودھیا جانتی تھی کہ یہ زمانہ ہی بہکا ہوا ہوتا ہے۔ قدم خود ہی لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگے اور آدمی گر جائے۔ اور جب وہ پارو کے بارے میں سوچتی تو اسے اپنے بیتے دن یاد آجاتے۔ کبھی کبھی وہ پارو کو دیکھتی تھی۔ کام کرتے کرتے یکایک پارو کا چہرہ دمکنے لگتا۔ دبی دبی مسکراہٹ چہرے پر چھا جاتی۔ پھر چہرہ لال ہو جاتا۔ اور ہونٹ تھرتھرانے لگتے۔ وہ کام چھوڑ کر پلنگ پر لیٹ جاتی۔ اور دیر تک اکیلی پڑی رہتی۔ ایسی حالت خاص طور پر اس دن ہو جاتی جب کوئی پارو کے گونے کی بات چھیڑ دیتا۔

اور ردھیا خود سوچ میں پڑ جاتی ۔ اس کو اپنے دن یاد آنے لگتے ۔ جب اس کا بھی یہی حال ہوتا تھا ۔ ردھیا پارو کو بچپن سے اپنے ساتھ سلاتی تھی ۔ بچپن میں وہ ہاتھ پاؤں پھینکتی تھی ۔ اور کبھی کبھی ردھیا کو چوٹ بھی لگ جاتی تھی ۔ لیکن اب وہ کبھی کبھی اپنے سارے بدن کا بوجھ ردھیا پر ڈال دیتی اور نیند میں اُس سے لپٹ جاتی ۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی تھی ۔ ردھیا جانتی تھی یہی جوانی ہے ۔ وہ بڑے پیار سے پارو کو الگ کر دیتی ۔ لیکن کبھی کبھی پارو کے بدن کا بوجھ اسے خود بھی اچھا لگنے لگتا ۔ اور وہ بہت سی باتیں سوچنے لگتی ۔ کچھ پارو کے بارے میں اور کچھ اپنے بارے میں ۔ اور اپنے دل کی ان چنگاریوں کو سلگتی محسوس کرتی جن کو اس نے خود جلا کر اور راکھ بنا کر چھپا رکھا تھا ۔ پارو جب سونے میں انگڑائی لیتی اور بدن کو کھینچتی تو اسے معلوم ہوتا کہ خود اس کا بدن بھی ٹوٹ رہا ہے ۔ ہڈی ہڈی اینٹھ رہی ہے ۔ اور اس کی سانس تیز تیز چلنے لگتی تھی ۔ ایسے میں جب پارو اپنے بدن کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیتی اور اس کی گرم گرم سانس ردھیا کے چہرے پر پھیلتی ، پارو کے بھرے ہوئے سینے کا دباؤ اس کے سینے پر پڑتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل جاتی ۔ اور وہ پارو کو اسی طرح سینے سے لگائے پڑی رہتی ۔ بہت سی باتیں اس کے دماغ میں آتیں ۔ اور اس رات اس کی نیند حرام ہو جاتی ۔ بڑی بے چینی کے ساتھ رات کاٹ پاتی ۔ اور دوسرے دن طبیعت خراب سی رہتی ۔

کبھی کبھی ردھیا کو اپنے اوپر بڑا غصہ آتا تھا ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی تھی ۔ اس وقت اس نے اپنے دل کے اندر سے ساری باتیں نکال کر پھینک دی تھیں ۔ تیرہ چودہ سال تک اس کا دل و دماغ سادہ کاغذ کی طرح تھا ۔ وہ بیٹی ساس اور گھر کے علاوہ ہر چیز کو بھلا چکی تھی ۔ اپنے آپ کو بھی ۔ لیکن اب پارو کو دیکھ کر بہت سی باتیں یاد آنے لگتیں ۔

اور اپنے آپ کو ہر موقع پر موجود محسوس کرتی۔ اتنا زیادہ کہ اگر اس کی طرف کوئی دیکھتا تو اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ اور اگر کوئی مرد دیکھتا تو سارے جسم میں لہریں دوڑنے لگتیں۔ ایک دن رشتہ کے ایک دیور نے مذاق مذاق میں کہہ دیا تھا۔ بھوجی ابھی تو خود جوان ہے۔ تیرا انگ انگ نکھرا ہوا ہے۔ ذرا آئینے میں اپنے کو دیکھ لے۔ تو ردھیا کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ گرم دھارے اس کے رونئیں رونئیں سے پھوٹ پڑے۔ اور فوراً ہی برف سے زیادہ ٹھنڈے قطرے بن گئے۔ اس دن اس نے سچ مچ آئینہ دیکھا تھا۔ اور محسوس کیا تھا اب بھی اس کا چہرہ کھلایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں وہی پہلی سی چمک تھی۔ پھر اس نے اپنے بدن کو دیکھا تھا۔ بانہہ بھرے بھرے تھے۔ اور سینے کا اُبھار ویسا ہی تھا کہ چولی کا بٹن کھنچتا اور ایسا لگتا کہ اب ٹوٹ جائے گا۔ اور ردھیا کو ایسا لگا تھا کہ بس اب وہ جکڑا جانے والی ہے۔ اس نے گھبرا کر آئینہ رکھ دیا۔ اور دیوار سے ٹنگی ہوئی بھگوان کرشن کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور دل ہی دل میں پرارتھنا کرنے کے بعد اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ پارو کا گونا ہو جائے اور وہ اپنے گھر پہنچ جائے تو بوڑھی ساس کو لے کر ساتوں دھام کی تیرتھ یاترا پر چلی جائے گی۔ اور لوٹنے کے بعد رام نام جپ کر گذار دے گی۔ یہ جیون بھی سپھل رہے اور اگلا جیون بھی سپھل رہے۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہی تھی۔ اور بھگوان کو بھی۔ اور وہ گھبرا گئی تھی۔ کہ آخر اُس کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ بیٹی جوان ہو گئی ہے اب اس کا گونا ہو گا۔ داماد آئے گا۔ وہ اپنی سسرال جائے گی۔ اس کے بچے ہوں گے وہ نانی بن جائے گی۔ اس کی گنتی بڑی بوڑھیوں میں ہونے لگے گی۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ اس کی عمر اب تینتس سال تھی۔ پھر اس کے ساتھ ایک خیال آ گیا کہ اس کی بڑی بہن اس سے تین سال بڑی تھی اور ٹھیک ہی

سال پہلے اُس کے بچہ ہوا تھا۔ بڑی بہن تو دُبلی پتلی اور مریل سی تھی۔ اور وہ خود بھری پوری جوان لگتی تھی۔ باہر کا کوئی آدمی اسے دیکھ کر پارو کو اس کی بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن بتاتا۔ انجان تو انجان بہت سی ناطے کی عورتوں نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی۔ اور وقت سے پہلے بیوہ ہو جانے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ جب وہ پارو کو دیکھتی اور لوگوں کی باتیں یاد کرتی تو اس کا دل جیسے ڈولنے لگتا۔ اور محسوس کرتی کہ جوانی پار در پر آتی ہے۔ اور نشہ اس پر چھایا رہتا ہے۔ جتنا سوچتی دل کو لہکتا ہوا پاتی۔ اور کبھی کبھی سوچتے سوچتے وہ ایسا محسوس کرتی کہ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور اس کا دل باہر نکل آئے گا۔ جب کوئی مرد اس سے کوئی معمولی بات بھی کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ جب بھی کوئی جوان مرد اس کے سامنے آجاتا تو اس کی آنکھیں اس پر جھکی پڑتیں۔ اور وہ اپنے کو بہت ہی بے سہارا محسوس کرتی۔ جب بھی وہ گھبرا جاتی تو بھاگ کر بھگوان کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اسے کچھ سکون ملتا۔

پارو کے گونا کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ گھر میں بہت سے ناتے والے بھرے تھے۔ ردھیا کی آنکھوں میں کچھ تکلیف تھی۔ رات کو سوتے وقت آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ صبح کو نہا دھو کر سفید کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ رشتہ کے ایک نند نے شوخی سے چٹکی لی۔ اور آہستہ سے کان میں بولی۔ بھوجی ان آنکھوں کی کٹار کس پر چلے گی۔ ذرا آئینہ میں تو دیکھ کاجل جلم ڈھا رہا ہے۔ ردھیا کو معلوم ہوا کہ اس کی نند نے بدن میں بجلی کا تار چھوا دیا۔ اور سارے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا دل اُلٹنے پلٹنے لگا۔ اور اس نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ اور نند کے جانے کے بعد موقع پا کر کمرے میں آئینہ دیکھنے گئی۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ پندرہ سال پہلے

کی ردھیا ہے۔ وہی چتون، وہی تیکھا پن، وہی دمک اور وہی تازگی۔ اپنی کاجل بھری آنکھیں اسے خود بھی بڑی خوب صورت معلوم ہو ئیں۔ اور دل میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ مریادا کے نام پر اس نے اپنی زندگی خواہ مخواہ برباد کر دی۔ اور اب بھی ویسی ہی اُداس زندگی کاٹے جا رہی ہے۔ اگر ماں باپ کا کہا مانتی، بہنوئی کا کہا مانتی تو آج زندگی ایسی اُداس نہ ہوتی۔ زیادہ آرام اور دلچسپی کے ساتھ کٹتی۔ ایک بیٹی کی دیکھ بھال تو دوسرا بیاہ کر کے بھی کر سکتی تھی۔ اور وہ اپنے ضد پر پچھتانے لگی۔ اگر وہ کلکتہ والے بہنوئی سے بیاہ کر لیتی تو اس کا سارا غم ڈھل جاتا۔ اور یہ کوئی بات بھی تو نہیں تھی۔ اس کی برادری میں بیوہ عورتوں کا بیاہ ہوتا ہی تھا۔ کوئی کچھ بولتا تو نہیں۔ اسے بہنوئی کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ وہ ساری باتیں جو گونا سے پہلے اس نے کہی تھیں۔ اور وہ بھی جو اس کے بیوہ ہونے کے بعد کہی تھیں۔ اور اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ بہنوئی کتنا اُداس ہو گیا تھا۔ جاتے وقت اس کا چہرہ کتنا اترا ہوا تھا۔ اور اس سے ہمدردی کی ایک زبردست لہر اس کے دل میں اُٹھی اور وہ دیر تک پچھتاتی رہی، سوچتی رہی کہ اس نقصان کو کبھی پورا نہیں کر سکے گی۔

پارو کے گونا کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ برات آنے میں دو ہی چار دنوں کی دیر تھی۔ وہ کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ مگر اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل کے سارے تار تیزی سے جھنجھنا اُٹھے ہیں۔ اور دل کے اندر سے کوئی میٹھا میٹھا گیت ابل رہا ہے۔ جب بھی کوئی مرد اس سے کچھ پوچھنے آتا تو دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتی۔ اور اس کے پاس سے اُٹھنے کو اس کا دل نہیں چاہتا اور جب وہ چلا جاتا تو بھی کہہ دیتی پھر آنا کام بہت ہیں۔ اور دل میں کہتی پارو کا گونا ہو جائے پھر اپنی اکیلی زندگی رہ جائے گی۔ اور جب گونا سے دو دن پہلے کلکتہ سے اس کا بہنوئی آ گیا تو معلوم ہوا کہ سارا گھر ناچ رہا ہے۔ منہ سے کچھ بولتی تھی اور دل میں کچھ سوچتی تھی۔ سوچتی تھی کہ پارو کا

گونا ہو جائے گا۔ وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ پھر وہ آزاد ہو جائے گی۔ ایک بوڑھی سانس تو دیکھا جائے گا۔
وہ بھی پکا ہوا پھل ہے کب ڈالی سے ٹپک جائے۔ پھر اپنا گھر اپنا راج۔

ایک ڈیڑھ سال سے ردھیا ایک ساتھ دو زندگیاں گذار رہی تھی۔ ایک زندگی وہ جسے سارے لوگ دیکھ اور جان رہے تھے۔ اور ایک وہ جسے وہی اکیلے جانتی تھی۔ جو نہ کسی کو معلوم ہو سکتی تھی۔ اور نہ جسے وہ ظاہر کر سکتی تھی۔ ایک زندگی وہ تھی جو طوفانوں سے ٹکراتی ہوئی مضبوط جہاز کی طرح آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ کہاں جا کر رکے گی۔ کبھی کبھی اسے اپنے اوپر غصہ آتا تھا اور کبھی کبھی پارو پر اور جب سوچنے بیٹھتی تو فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ قصور اس کا اپنا ہے یا پارو کا۔

بہنوئی کو خود ہی خط لکھ کر اس نے بلایا تھا۔ وہ آیا تو اسی ٹھاٹ کے ساتھ۔ صاف کپڑے، انگریزی بال اور پاؤں میں چمکیلا جوتا۔ ردھیا اور پارو کے لئے کپڑا بھی لایا۔ اور ملا تو اسی طرح۔ ردھیا کا دل کروٹیں بدلنے لگا۔ اب بھی وہ تگڑا اور ہنس مکھ تھا۔ بس کان کے پاس بالوں میں سفیدی آ رہی تھی۔ پہلے تو پارو کے گونا پر اس نے خوشی ظاہر کی۔ پھر پوچھنے لگا کہ اس کی بیٹی کے بیاہ میں کلکتہ جائے گی نا۔ ردھیا کا دل کلکتہ چلنے کی بات اس کے منہ سے سنتے ہی کھل اٹھا۔ اور وہ بولی ضرور چلیں گے۔ اور اس کے دل نے کہا۔ جائیں گے کیسے نہیں۔ ہم تو تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تم ہی تو ایک ایسے آدمی ہو جس کو سچ مچ میری فکر اور پرواہ ہے۔ اور پھر اس کا دل دکھ گیا۔ کیوں اسے ایسا سوکھا جواب دیا تھا۔ مرنے والا اب لوٹ کر تو آئے گا نہیں۔ بیاہ کر لیتی تو زندگی سکھ چین سے کٹتی۔ بے کار ہی سب کی بات ٹھکرا دی اور کانٹوں میں زندگی تو گھسیٹتی رہی۔

ردھیا نے جو کچھ دھیلا دھیلا کر کے اکٹھا کیا تھا۔ دل کھول کر پارو کے گونا میں خرچ

کرنے لگی۔ اور تھا بھی کون جس کے لئے بچا کر رکھتی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ پارو کا گونا ہو جائے گا تو سب کچھ بیٹی داماد کے حوالہ کر دے گی۔ اور چپ چاپ رام نام جپے گی۔ اور زندگی گذار دے گی۔ لیکن جب گونا کا دن نزدیک آنے لگا تو سوچنے لگی اب پارو کے سسرال چلی جانے کے بعد وہ کیا کرے گی۔ کس کے لئے کرے گی۔ اس کی زندگی کا کیا مقصد رہ جائے گا۔ اکیلی اِس گھر میں بھوت کی طرح زندگی کے دن کیسے کاٹے گی۔ اس کی عمر بھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ اسے بوڑھی کہا جائے۔ اور اس کی صحت۔ اس نے بار بار دیکھا اور سوچا تھا کہ بہتوں کی نظر اس پر ترچھی پڑتی تھی۔ نہ تو اس نے اپنا ڈھنگ ہی بدل لیا تھا۔ اور وقت سے بہت پہلے اپنے کو بوڑھی بنا لیا تھا۔ ورنہ اب بھی بہت سے لوگ تھے جو اس کو اپنے گلے کا ہار بنانے کو تیار تھے۔ اُس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ پارو کے جانے کے بعد اُس کی زندگی بنجر میدان بن کر رہ جائے گی۔ جس میں کہیں کوئی پھل والا پیڑ تو ایک طرف کہیں کوئی گھاس بھی نظر نہیں آئے گی۔ جب اس کا بہنوئی آگیا تو اسے بڑا سہارا ملا۔ اور اس نے سوچا کہ اطمینان سے ہر طرح کی باتیں اس سے کرے گی۔ اور اپنی زندگی کا کوئی نقشہ بنائے گی۔ لیکن بیاہ کی بھیڑ بھاڑ میں اس سے دل کھول کر باتیں نہ ہو سکیں۔ جو بھی باتیں ہوئیں پارو اور اس کے گونا کے بارے میں۔ نہ اس کو بات کرنے کی فرصت تھی اور نہ اس کے بہنوئی کو۔

آخر پارو کا گونا ہو گیا۔ اور پارو روتی ہوئی سسرال چلی گئی۔ ردھیا کا دل جیسے بیٹھ گیا۔ اس کی ساری زندگی کی کمائی دوسرے کی ہو گئی۔ اس کا اپنا ہاتھ خالی رہ گیا۔ خوب روئی۔ آنسو تھے جو رکتے ہی نہ تھے۔ پھر یہ سوچ کر ذرا سکون ہوا کہ اسی دن کے انتظار میں پلکوں میں راتیں کاٹ دیا کرتی تھی۔ کون لڑکی ساری زندگی ماں باپ کے گھر میں رہتی ہے۔ اور یہ اچھا بھی نہیں۔ لڑکی کی

خوش نصیبی بھی یہی ہے کہ اپنا گھر بسائے اور ماں باپ کی خوش نصیبی یہ کہ اس کا بسا یا گھر دیکھے۔ اُس میں لڑکی کی بھلائی ہے۔ اور ماں باپ کی بھی۔ اور یہ سوچ کر اسے سکون آ گیا۔

گونا کے دوسرے ہی دن سے مہمان جانے لگے۔ مہمان کے جانے کے بعد ردھیا کو محسوس ہوتا کہ اس کے گھر میں سناٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کو ڈر معلوم ہونے لگتا۔ کہ سارے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد جب بالکل سناٹا ہو جائے گا ایک وہ اور ایک بوڑھی ساس رہ جائے گی۔ تو اس گھر کی اور اس کی کیا حالت ہو گی اور اکیلے پلنگ پر اسے نیند کیسے آئے گی۔ پارو تو دور جا چکی اب وہ اکیلی ہی سوئے گی۔ اسے پارو کا سونا، اس کی گہری نیند یاد آتی۔ اور نیند کی حالت میں اس کی ہر حرکت۔ اور جیسے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اور وہ سوچ سوچ کر گھبرانے لگی کہ اکیلے اس کی زندگی کیسے کٹے گی۔

سارے مہمان چلے گئے۔ بس ایک دو اور تھے جو جانے کی تیاریوں میں تھے۔ اس کے بہنوئی نے بھی کلکتہ جانے کو کہا تو ردھیا کے دل کو زور کا دھکا لگا۔ اس کے بہنوئی نے کہا تھا کہ اس کا اب جانا ضروری ہے۔ کلکتہ جیسے شہر میں اس کے بچے اکیلے ہیں۔ اور کام کا بھی نقصان ہو گا۔ اور اس نے بہنوئی کی خوشامد کی تھی کہ دو تین دن اور رہ جائیے پھر وہ بات کرے گی۔ اور وہ رک گیا تھا۔ اور ردھیا سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا بات کرے گی۔ اور کس طرح اپنے دل کا حال اسے بتائے گی۔ اسے بار بار خیال آتا کہ اس نے اسے کتنا روکھا جواب دیا تھا۔ اور بہنوئی کتنا بھلا آدمی تھا کہ خط پاتے ہی اپنے بچوں کو چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اور سب تو گونا ہوتے ہی چلے بھی گئے۔ اور جو دو ایک تھے وہ جانے والے ہی تھے مگر وہ روکنے پر رک گیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے اور بہنوئی کے پاؤں پر سر رکھ دے اور کہے کہ اس سے غلطی ہو گئی تھی عقل

نہیں تھی۔ معاف کر دے۔

دو دن اور بھی گذر گئے۔ لیکن جب تک ایک مہمان بھی رہا وہ اپنے بہنوئی سے بات نہ کر سکی۔ بس اِدھر اُدھر کی۔ اور جو دل کی تھی وہ دل ہی میں رہ گئی۔ جو کچھ کہنے کو سوچتی وہ سب اس کے دل کے اندر ہی دب کر رہ جاتا۔ ایک تو رات گئے تک لوگ آتے ہی جاتے رہتے اور پھر یہ اطمینان نہیں کہ کب کون آجائے۔ پھر اس کا بہنوئی بھی اتنی ہی باتیں کرتا جو ضروری ہوتیں۔ اور کام میں لگا رہتا۔ کبھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو بڑھیا کا دل بڑھتا۔ اور بڑھیا بھی دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔ جب بھی سامنے آتا اور بات کرتا تو کہتا کہ اب بچوں میں جی لگا ہوا ہے۔ بس انہیں کی فکر ہے۔ سب اپنے ٹھکانے لگ جائیں تو اطمینان ہو۔ بڑھیا کو اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ لڑکی پالنا کتنا کٹھن کام ہے۔ اور اس بے چارے کی تو تین تین بیٹیاں تھیں۔ اور ان کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی دوسری عورت بھی دو سال پہلے تین بچے چھوڑ کر مر چکی تھی۔ اس کا دل کہتا کہ کہے "اب میں چلوں گی۔ میں ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ اب اس گھر میں میرا ہے بھی کون۔ جس کے لئے یہاں اکیلی گھلتی رہوں گی"۔ لیکن ہر بار جیسے اس کے منہ پر مہر لگ جاتی۔ شرم زبان کو پکڑ لیتی۔ اور کبھی اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھتی۔ پہلے وہی کچھ بولے ورنہ دل میں کیا کہے گا۔ جب ہم نے بیاہ کرنے کو کہا تھا۔ تو اینٹھ گئی تھی۔ اور اب پاؤں کی دھول بننے کو تیار ہے۔ اور کبھی یہ بھی ڈر لگتا کہ کہیں کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دے جو پھر اس کو ساری زندگی منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہے۔ اور وہ دل ہی دل میں چپ رہی۔ کبھی سوچتی لوگ کیا کہیں گے۔ داماد کیا سوچے گا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس کے بہنوئی نے کہا کہ وہ صبح سویرے ہی چلا جائے گا۔

اور ردھیا کا ماتھا جیسے چکرا گیا۔ کھانا کھا کر وہ تو باہر دروازے پر سونے چلا گیا اور ساس بھی کھا پی کر سو گئی۔ ادھر کئی دنوں سے بڑھیا کی طبیعت ڈھیلی تھی۔ ردھیا کام ختم کر کے پلنگ پر تھک کر چور پڑ گئی۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پارو کو سسرال گئے پانچ دن ہو چکے تھے اور واپسی کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ گھر سنسان ہو رہا تھا۔ سناٹے اور اکیلاپن کے احساس سے وہ تڑپ سی گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا بہنوئی سائبان میں سویا ہوا تھا۔ چاند کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ردھیا کا جی چاہا کہ اسے اٹھائے اور باتیں کرے۔ یہی وقت اس سے اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کا تھا وہ دیر تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی مگر اس کے پاؤں جیسے جم کر رہ گئے۔ اس نے کئی بار ہمت کی کہ آگے بڑھے۔ اسے اٹھائے اور اسے ساری باتیں سمجھا دے۔ کہ اب اس گھر میں اس کا کوئی بھی نہیں رہا۔ اور اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کہیں بھی۔ چاہے یہ گھر ہو۔ یا کوئی اور۔ اب وہ اس سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ پہلے جو بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا تو غلطی کی تھی۔ اب پھر اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی۔ اس نے پھر ہمت کی۔ قدم بڑھائے کہ اُسے اُٹھائے اور اس کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دے۔ اور اس کی گود میں پھیل جائے۔ ابھی وہ جوان تھی اور زندگی کا لطف اُٹھا سکتی تھی۔ اور وہ دونوں ــــ دنیا کی پروا کئے بغیر ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ اس نے ہمت کر کے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یکایک اس کی ساس کی آواز آئی۔

"بہو ذرا پانی دو۔ پیاس لگ رہی ہے"

اور وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔ جلدی سے دروازہ بند کیا۔ اور گلاس میں پانی لے کر ساس کے پاس پہنچی۔ بوڑھی ساس نے پانی کا دو گھونٹ پیا اور بولی۔

"بہو تو تپسیا کر رہی ہے، میری سیوا نہیں۔ اس جنم میں تجھے کچھ نہ ملا۔ اگلے جنم میں بھگوان اس تپسیا کا پھل ضرور دے گا۔"

اور ردھیا کا دل جیسے ہل گیا۔ سارا بدن تھر تھرانے لگا اور وہ کانپنے لگی۔ جیسے طوفان میں کوئی نازک ڈالی کانپے۔ ساس نے دیکھا اور بولی۔

"بیٹی اب سو جا تو بہت تھکی ہوئی ہے۔"

ردھیا ساس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بوڑھی نے پھر کہا۔

"جا سو جا بیٹی، تیرا حال دیکھ کر میرا دل ڈوبتا ہے۔"

ردھیا بولی۔

"ماں اب میں تمہارے پاس سوؤں گی۔ تم کو پکارنے میں تکلیف ہوتی ہے۔"

اور وہ ساس کے بستر پر ایک کنارے لڑھک گئی۔

———— ⁘ ————
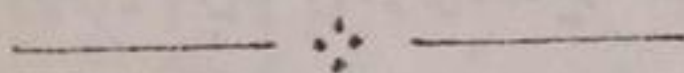
کانچی

گفتگو بمبئی

۱۹۷۶ء

کانچی

سلی گوری سے دارجلنگ جانے والی چھوٹی ریل گاڑی کو دیکھ کر منیش کو حیرت ہوئی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پتلی پتلی اور کم جگہ میں ریل کی پٹریاں، چھوٹا سا انجن اور چھوٹے چھوٹے ڈبے۔ اتنی چھوٹی ریل گاڑی کو دیکھ کر اسے ایسا لگا، جیسے گلی ور گاڑی کے انجن اور ڈبوں کو بونوں کے دیس سے اٹھا کر لے آیا اور چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسے سلی گوری سے کرسیانگ تک اسی ریل گاڑی سے سفر کرنا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی چھوٹی ریل گاڑی کتنی دیر میں کرسیانگ پہنچ سکے گی۔ وہ کلکتہ سے سلی گوری تک دارجلنگ میل سے آیا تھا۔ بڑا انجن، بڑے بڑے ڈبے اور لمبی گاڑی سے اترنے کے بعد اسے چھوٹی گاڑی سے سفر کرنا تھا۔ اسے بڑا افسوس ہوا کہ اس نے اپنا پروگرام کیوں بدلا۔ سلی گوری میں کمپنی کی کار آجاتی اور وہ آرام کے ساتھ کرسیانگ پہنچ جاتا۔ لیکن اس نے اپنے ایک ملاقاتی مسٹر گپتا اور ان کی پتنی کے کہنے سے اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ اور کرسیانگ تک ان کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ گپتا اور اس کی پتنی کو دارجلنگ جانا تھا۔ اور اُن دونوں نے رائے دی تھی کہ چھوٹی ریل گاڑی سے سفر زیادہ دلچسپ رہے گا۔ موٹر تو تیزی کے ساتھ گزر جائے گی۔ لیکن چھوٹی ریل گاڑی سے پہاڑی مناظر دیکھے جا سکیں گے۔ اس نے اپنے کرسیانگ آفس کو لکھا تھا

کہ ریلوے اسٹیشن پر ہی چند آدمی آجائیں۔ لیکن اب ریل گاڑی کو دیکھنے کے بعد پچھتا رہا تھا۔ وہ پہلی بار کرسیانگ جارہا تھا اور اپنی کمپنی کے کاغذات اور کاروبار کے علاوہ اس علاقے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ مسٹر اور مسز گپتا کے ساتھ ریستوراں سے چائے پی کر نکلا اور سامان رکھوا کر ریل میں بیٹھ گیا۔ تو اُسے اپنے اوپر ہنسی آئی، اور بڑا لطف آیا۔ اُسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ ایک کارنیوال میں اتنی ہی چھوٹی ریل گاڑی پر بیٹھا تھا۔ اور دیر تک کارنیوال کے اندر گھومتا رہا تھا۔ اُسے بڑا لطف آیا تھا۔ مگر وہ بچپن کا زمانہ تھا۔ اور اب زمانہ بدل گیا تھا۔ پھر بھی جب ریل گاڑی چل پڑی تو اُسے مزا آیا۔ گاڑی چھک چھک کرتی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ساتھ ساتھ دارجلنگ جانے والی سڑک تھی۔ جس پر موٹر کاریں اور بسیں، ریل گاڑی کو تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑ کر گزر رہی تھیں۔ اور منیش کو اپنے اوپر ہنسی آجاتی تھی۔ وہ مسٹر اور مسز گپتا کو دیکھتا تھا جو بار بار ہر چیز کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ گاڑی اوپر چڑھتی گئی۔ کبھی کبھی گھوم کر اور کبھی سیدھی۔ ریل کی پٹریاں چھوٹتی گئیں اور وہ گاڑی میں بیٹھا اونچائی پر چڑھتا گیا۔ جب اس نے نیچے نظر ڈالی تو پٹریاں نظر آئیں۔ گاڑی ذرا مڑی تو ایک چھوٹا انجن پیچھا کرتا نظر آیا۔ اس انجن میں بھی تین ڈبے تھے۔ ایک اسٹیشن آیا۔ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رُکی اور چل پڑی۔ پھر کچھ دیر کے بعد دوسرا اسٹیشن آیا۔ گاڑی رُک گئی۔ ذرا دیر کے بعد پیچھے ہٹنے لگی۔ پھر رُک گئی۔ پھر آگے بڑھی اور بڑھتی گئی منیش نے دیکھا۔ ریلوے اسٹیشن ڈھائی تین سو فٹ نیچے رہ گیا۔ اور گاڑی اونچائی کی طرف بڑھتی گئی۔ اسے گاڑی کا سفر دلچسپ معلوم ہوا۔ اور اس نے مسٹر گپتا اور اس کی پتنی کو دیکھا۔ اور بولا۔

"گاڑی کرسیانگ کب پہنچے گی؟"

"بارہ بجے تک۔"

گپتا نے بتایا اور خود پہاڑی نظاروں میں کھو گیا۔ اس کی پتنی بولی۔

"اس علاقے میں کرسیانگ سب سے خوبصورت جگہ ہے۔"

فرسٹ کلاس ڈبے میں صرف تین آدمی تھے۔ منیش، راجیش گپتا اور اس کی پتنی سمترا۔ منیش اور راجیش کی ملاقات یونی ورسٹی کی تھی۔ راجیش ویسے تو عمر میں منیش سے بڑا تھا لیکن یونی ورسٹی کی علمی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے دونوں میں ملاقات ہو گئی تھی۔ خیالات میں بعض مسئلوں پر اختلاف ہونے کے باوجود دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ دونوں کی بڑی تمنا تھی کہ وہ یونی ورسٹی میں پڑھاتے۔ لیکن حالات نے دونوں کو وہ نہیں بننے دیا جو وہ بننا چاہتے تھے۔ راجیش گپتا کا باپ بیمار ہو کر کاروبار سے الگ ہو گیا اور ساری ذمہ داری راجیش کو سنبھالنی پڑی۔ منیش کا باپ مر گیا۔ اس کی کمپنی نے منیش کو اچھی ملازمت دے دی اور حالات ایسے تھے کہ منیش کو ملازمت کرنی پڑی۔ بیوہ ماں، چھوٹے بھائی بہن کا بوجھ اس کے سر پر تھا۔ اب ایک سال دفتر میں تربیت حاصل کرنے کے بعد کرسیانگ ڈپو کا منیجر ہو کر جا رہا تھا۔ اور بہت سی باتیں سوچتا جا رہا تھا۔ ریل گاڑی اپنی چال سے دارجلنگ کی طرف بڑھتی رہی۔ اور وہ نظر گھما کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ایک طرف پہاڑ تھا، اس پر ہرے ہرے اور اونچے درخت۔ دوسری طرف دارجلنگ جانے والی سڑک اور اس کے بعد ڈھلوان۔ ڈھلوان میں چائے کے ہرے ہرے پودے۔ جدھر اور جہاں تک نظر جاتی تھی ہریالی ہی ہریالی تھی۔ اور ایک خاص قسم کی دل کشی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ پہاڑ کی سیر کر رہا تھا۔ اس لئے اسے ہر چیز نئی اور دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر ایسی نہیں کہ برداشت نہ ہو۔ مئی کا مہینہ تھا اور سلی گوری تک اس نے گرمی محسوس کی تھی۔ مگر اب گرمی نہیں رہ گئی تھی۔ اُسے ہر چیز نئی معلوم ہو رہی تھی۔ میدانی علاقوں سے بالکل مختلف۔

ریل گاڑی کرسیانگ ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ تو منیش اُتر پڑا۔ اسے لینے کے لئے اسٹیشن پر تین آدمی موجود تھے۔ ڈپو کا اسسٹنٹ منیجر اربندو ساہا، بڑا بابو امل داس اور چپراسی کھڑک بہادر۔ پہلے وہ تینوں سے ملا۔ پھر تھوڑی دیر راجیش گپتا اور اس کی پتنی سے باتیں کرتا رہا۔ کرسیانگ ریلوے اسٹیشن دوسرے اسٹیشنوں کے مقابلے میں بڑا اور صاف ستھرا تھا۔ چھوٹا سا میدان جیسا تھا، اور باہر بہت سے مکان تھے۔ دکانیں تھیں۔ سامنے پہاڑی پر اونچے اونچے درخت اور بہت سے مکان تھے۔ سڑک پر بسیں اور موٹر گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اسے یہاں رہنا تھا۔ اور اس خیال سے وہ بہت خوش تھا۔ راستے میں اس نے بہت سے خوبصورت نظارے دیکھے تھے۔ اور اب ایسے مناظر دیکھ رہا تھا، جو پہلے کبھی خواب میں بھی اسے نظر نہیں آئے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا اور آسمان صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ مگر اس کے بدن میں ہلکی ہلکی ٹھنڈی سرسراہٹ پھیل رہی تھی۔ گاڑی کا وقت ہوگیا۔ تو مسٹر اور مسز گپتا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پھر سیٹی بجی اور گاڑی چھک چھک کرتی ہوئی دارجلنگ روانہ ہوگئی۔

منیش ایک انگریزی چائے کمپنی کا ڈپو منیجر بن کر آیا تھا۔ کمپنی کا اپنا چائے کا باغان نہیں تھا۔ دوسرے بگانوں سے پتیاں خرید کر اپنے کارخانے میں مختلف قسموں اور قیمتوں کی چائے تیار کرتی تھی۔ اور ٹین کے ڈبوں میں بند کر کے یورپ، امریکہ اور عرب ملکوں کو بھیجتی تھی۔

مسٹر اور مسز گپتا کے چلے جانے کے بعد وہ اربندو ساہا اور امل داس کے ساتھ چلا۔ اربندو ساہا نے کہا۔

"اچھا ہی ہوا۔ ریل گاڑی سے چلے آئے۔ کل شام کو کار خراب ہوگئی اور کارخانے بھیج دینا پڑا۔"

منیش مسکرایا اور بولا۔

"اگر موٹر سے آتا تو جلدی سے چلا آتا اور اتنا کچھ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔"

اربندو ساہا بولا۔

"مکان یہاں سے دور نہیں ہے۔ آگے چل کر سڑک سے نظر آنے لگے گا لیکن نزدیک کے راستے والی چڑھائی بالکل کھڑی ہے۔ آپ کو ابھی پہاڑ کی چڑھائی کی عادت نہیں ہے اس لیے کھڑگ بہادر سامان لے کر دوسرے راستے جائے گا۔ اور ہم لوگ سڑک سے ہو کر چلیں گے۔ چڑھائی تو اس راستے میں بھی ملے گی۔ مگر اتنی کھڑی نہیں۔ پھر آپ کو بھی دھیرے دھیرے عادت ہو جائے گی۔ اور آنے جانے لگیں گے۔"

کھڑگ بہادر نے چار قلیوں پر سامان اٹھوایا اور چلا گیا۔ منیش اربندو ساہا اور امل داس کے ساتھ دارجلنگ روڈ پر چل پڑا۔ اربندو ساہا اسے ساری باتیں بتا رہا تھا مکان اونچائی پر ہے۔ اور وہاں تک جانے کا راستہ پتلا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مکان سڑک سے دکھائی دینے لگے گا۔ کمپنی نے یہ مکان پہلے ڈپو منیجر کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ جو ڈپو منیجر آتا تھا وہ اس میں رہتا تھا۔ بعد میں اسے خرید لیا۔ مکان چھوٹا مگر خوب صورت اور آرام دہ ہے۔ منیش دونوں کے ساتھ باتیں کرتا اور چلتا رہا۔ لیکن راستہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ برابر اونچائی پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں تناؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اور سانس بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی پہاڑ کی طرف اوپر دیکھتا اور کبھی سڑک سے نیچے کی طرف۔ اوپر بڑے اور ہرے درخت تھے اور نیچے چائے کے باگان۔ چھوٹے چھوٹے پودے۔ اور ان میں کام کرنے والے مزدور، مرد اور عورتیں۔ اسے ہر چیز نئی اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ وہ اربندو ساہا اور امل داس کی باتیں سنتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک جگہ رُک گئے۔ اربندو ساہا بولا۔

"اب ہم لوگ سڑک کو چھوڑ دیں گے۔ اور یہ جو راستہ پھوٹتا ہے اس پر چلیں گے۔ اب پہلے کچھ زیادہ چڑھائی ملتی ہے۔ لیکن اتنی دور تو پیدل چلنا ہی ہوتا ہے۔ گاڑی کا راستہ بھی نہیں ہے۔"

منیش کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہر طرف نظر گھما کر دیکھا۔ راستہ سڑک سے اونچائی کی طرف جاتا تھا، اور پتلا تھا۔ ایک ساتھ زیادہ سے زیادہ تین آدمی چل سکتے تھے۔ راستہ بھی بے مرمت سا تھا۔ راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے اور جھاڑیاں تھیں۔ تھوڑی دور چل کر ایک موڑ سا آگیا۔ وہاں درختوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ اور کئی راستے وہاں سے پھوٹتے تھے۔ منیش کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے دونوں پاؤں کو جھٹکا دیا۔ امل داس سمجھ گیا کہ اب منیش تھکن محسوس کر رہا ہے۔ اور بولا۔

"اب ہم لوگ پہنچ گئے۔ پانچ سات منٹ اور بس۔"

تینوں بڑھتے گئے۔ تھوڑی دور چل کر پھر کھلی جگہ نظر آئی۔ چھوٹا سا صحن۔ ہری ہری گھاس اور پھولوں کی کیاریاں۔ منیش کو جگہ اچھی معلوم ہوئی اور وہ رُک کر اسے دیکھنے لگا۔ امل داس بولا۔

"یہ کمپنی کے مکان کا حصہ ہے۔ اس کے اوپر مکان ہے۔"

منیش نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بولا۔

"مکان تو نظر نہیں آ رہا ہے۔"

امل داس نے کہا۔

"مکان پیچھے کی طرف ہے۔ اب دو منٹ سے زیادہ کا راستہ نہیں رہ گیا ہے۔"

تینوں بڑھتے گئے اور ذرا دیر میں مکان کے احاطے میں پہنچ گئے۔ مالی پھولوں کی کیاریوں سے گھاس نکال رہا تھا۔ اُس نے دیکھتے ہی آ کر سلام کیا۔ منیش نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے

لگا۔ مکان اُسے پہلی ہی نظر میں پسند آگیا۔ چاروں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ بیچ میں درختوں کو کاٹ کر زمین نکالی اور برابر کردی گئی تھی۔ مکان بنانے میں پتھر اور اینٹ کم اور لکڑی زیادہ خرچ کی گئی تھی۔ اینٹ بنیاد سے چبوترے تک تھی۔ اس کے بعد لکڑی کے موٹے موٹے تنوں کو گاڑ کر ان میں اندر اور باہر سے مضبوط تختے ٹھونک دیئے گئے تھے۔ چھت بھی لکڑی کی تھی اور سائبان بھی۔ اچھا خاصا صحن تھا، جس میں ہری ہری گھاس تھی۔ اور قرینے سے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ امل داس نے بتایا کہ مکان میں چار کمرے ہیں۔ اور پیچھے کی طرف تین کمرے الگ ہیں۔ ایک باورچی خانہ، ایک کوٹھری اناج رکھنے کے لئے۔ اور ایک نوکر کے رہنے کے لئے۔ کھڑگ بہادر قلیوں کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

منیش سائبان میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور وہاں سے اُس طرف کا نظارہ دیکھنے لگا۔ سامنے کنچن جنگا کی برف سے ڈھکی چوٹی نظر آرہی تھی۔ اور نیچے جہاں تک نظر جاتی تھی چائے کے ہرے ہرے پودے نظر آتے تھے۔ منیش بولا۔

"مکان تو بہت اچھا ہے۔"

امل داس نے جواب دیا۔

"یہ مکان سونار گڑھ کے راجا نریندر رائے نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ وہ بڑے شوقین آدمی تھے۔ ہر سال گرمی کے موسم میں یہاں آکر رہتے تھے۔ ان کا بڑا نام تھا۔ مگر اُن کے بعد ان کے بیٹوں میں میل نہیں رہا۔ آپس کی مقدمہ بازی میں سب برباد ہوگئے۔ یہ مکان ان کے منجھلے بیٹے بھوپیندر رائے کو ملا تھا۔ چند برسوں میں ہی یہ مکان بک گیا۔ پہلے کلکتہ کے ایک آدمی نے خرید لیا۔ لیکن وہ بھی صرف ایک سال آکر رہا تھا۔ پھر کمپنی نے کرائے پر لے لیا۔"

منیش بولا۔

"مکان بہت اچھا ہے۔ خوبصورت ہے اور یہاں سے بیٹھے بیٹھے دور دور کے نظارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن آفس جانا آنا آسان نہیں ہوگا۔"

امل داس نے جواب دیا۔

"ریلوے اسٹیشن سے دس بارہ منٹ کی چڑھائی ہے اور آفس سے بیس منٹ کی راہ ہے۔ مگر آپ کو پہاڑی راستے پر چلنے کی عادت نہیں۔ اور یہاں ذرا چڑھائی بھی سیدھی ہے۔ اس لئے ہم لوگ ذرا لمبے راستے سے آئے۔ کھڑگ بہادر سیدھا چڑھ کر آیا تو دس بارہ منٹ میں پہنچ گیا ہوگا۔ اور ہم لوگوں کو چالیس منٹ سے بھی زیادہ دیر تک چلنا پڑا۔"

منیش مسکرایا اور بولا۔

"یہاں رہ کر آنے جانے کی عادت ہو جائے گی۔ مگر ابھی تو اتنا تھک گیا ہوں جیسے دس کوس پیدل چل کر آ رہا ہوں۔"

امل داس اور ساہا مسکرائے۔ قلیوں کو مزدوری دے کر واپس کر دیا گیا۔ کھڑگ بہادر سامان کمرے میں لے جا کر کھولنے لگا۔

منیش سائبان میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اربندو ساہا اور امل داس بھی بیٹھ گئے۔

منیش بولا۔

"سب سے پہلے ایک نوکر کا انتظام کرنا ہوگا۔ جو وقت پر ناشتہ چائے دے اور دوسرے کام کر دے۔"

امل داس نے جواب دیا۔

"چوکیدار اور مالی تو کمپنی کے ہیں۔ مالی کام کر رہا ہے۔ شام کے وقت چلا جائے گا۔ اور چوکیدار

رات کے وقت کھانا کھا کر آتا ہے۔ رات بھر یہاں رہے گا۔ صبح سویرے چلا جائے گا۔ ویسے چوری کا کوئی ڈر نہیں۔ پہاڑی لوگ چور اور بے ایمان نہیں ہوتے۔ نوکر کا انتظام کھڑگ بہادر کر دے گا۔ کہہ رہا تھا کہ اسکی نظر میں کوئی اچھا آدمی ہے۔"

منیش اپنی ضرورت کی ساری چیزیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ پرانے نوکر بھی ساتھ لانا چاہتا تھا۔ لیکن دو دن پہلے اس نے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ کوئی نوکر ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ امل داس نے کھڑگ بہادر کو پکارا۔ وہ آیا تو بولا۔

"صاحب کے لئے ایک نوکر ٹھیک کرنا ہے جو کھانا پکائے، اور کھلائے۔ مگر آدمی اچھا ہو۔"

کھڑگ بہادر بولا۔

"آج ہی لائے گا صاحب۔ ہمارا پاس ایک اچھا آدمی ہے۔"

امل داس بولا۔

"کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور میں نے کھانا گھر پر پکوا لیا ہے۔"

منیش لوگوں کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے کا عادی نہیں تھا۔ کلکتہ جیسے شہر میں بھی اس کے دو ہی دوست تھے۔ اور چند ملنے والے۔ اس نے جواب دیا۔

"کھانے کا سامان تو میرے پاس موجود ہے۔ البتہ اگر ایک پیالی چائے مل جائے تو ضرور پینا چاہتا ہوں۔"

منیش کا جواب سن کر امل داس کا چہرہ اُتر گیا۔ منیش نے دیکھا تو اُسے خیال ہوا کہ امل اس نہ جانے کیا سمجھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امل بابو شکریہ۔ میں آپ کے ساتھ کھانا کھا کر بہت خوش ہوتا۔ لیکن اسٹیشن سے یہاں تک

آنے میں اتنا تھک گیا ہوں کہ اب کہیں جانے کی ہمت نہیں۔"

امل داس بولا۔

"میرے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا نوکر کھانا لے کر آ ہی رہا ہوگا۔"

منیش کچھ نہیں بولا۔ پھر دوسری باتیں نکل آئیں۔ کچھ آفس کی۔ کچھ کرسیانگ کی اور کچھ دارجلنگ کی۔ منیش کو اندازہ ہوا کہ وہ پہاڑی علاقے کی زندگی کو جتنی سخت سمجھتا تھا، اتنی سخت نہیں تھی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہوں تک پہنچنا بھی مشکل نہیں تھا۔ ہر جگہ جانے کے لئے اچھے راستے تھے۔ عادت نہ ہونے کی وجہ سے چاہے جتنی کٹھنائی ہو، لیکن یہاں کی زندگی کلکتہ کی تیز بھاگتی ہوئی زندگی سے بہر حال اچھی تھی۔ منیش سوچ ہی رہا تھا کہ امل داس بولا۔

"کرسیانگ اچھی جگہ ہے۔ آپ کو پسند آئے گی۔"

منیش نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ آفس کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کا کافی وقت ملے گا۔"

تھوڑی دیر میں امل داس کا اُڑیا نوکر کھانا لے کر آ گیا۔ منیش نے منہ ہاتھ دھویا اور صرف امل داس کا دل رکھنے کے لئے تھوڑا سا کھانا کھا لیا اور اُٹھ گیا۔ جب وہ مُنہ ہاتھ دھو کر آیا تو امل داس نے کہا۔

"کھڑگ بہادر نے آپ کا بستر ٹھیک کر دیا ہے۔ آپ ضرور تھک گئے ہوں گے۔ آرام کیجئے۔ شام کے وقت ہم لوگ آئیں گے، اگر آپ چاہیں تو کہیں چلیں گے۔"

اربند دسادا اور امل داس چلے گئے۔ منیش رات بھر کے سفر میں اتنا نہیں تھکا تھا جتنا اسٹیشن سے گھر تک چالیس منٹ پیدل چلنے میں۔ کھڑگ بہادر نے بستر کھول کر بچھا دیا تھا وہ

کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ رہا۔ اور بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ آفس کا کام تو کرنا ہی ہے۔ اس کے بعد وقت کیسے کٹے گا۔ اور کون لوگ ہوں گے، جن سے مل سکے گا۔ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

منیش کی نیند ٹوٹی تو شام ہو رہی تھی۔ کمبل کے اندر سے نکلا تو اسے سردی محسوس ہوئی۔ منہ ہاتھ دھوکر اور گرم گاؤن پہن کر سائبان میں آیا تو دھوپ ختم ہو رہی تھی، کن چن جنگا کی برفیلی سفید چوٹی پر ہلکی سرخی اور گہری سیاہی پھیل رہی تھی۔ نیچے وادی میں اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جیسے ہر چیز دھوئیں میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ ذرا دیر میں کھڑگ بہادر آگیا۔ اور بولا۔

"آدمی مل گیا صاحب اور چائے تیار ہے۔"

منیش کو یہ خبر سن کر اطمینان ہوا اور بولا۔

"منگوالو۔"

کھڑگ بہادر چلا گیا اور ذرا دیر میں ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ اُس نے کنارے فرش پر رکھ دی۔ پہلے سلام کیا۔ پھر چھوٹی میز اٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دی اور اس پر چائے کی ٹرے۔ اور الگ کھڑا ہو گیا۔ کھڑگ بہادر بولا۔

"اس کا نام لال بہادر ہے۔ دارجلنگ میں صاحب کا کھانا پکاتا تھا۔ اس کا پاس بہت دن تھا۔ صاحب بلایت چلا گیا تو اپنا گھر چلا آیا اور کہیں کام نہیں کیا۔ ہمارا ناتا لگتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے صاحب۔"

کھڑگ بہادر بہت سی باتیں بتا گیا۔ منیش چائے پیتا اور سنتا رہا۔ چائے مزیدار تھی۔ اور موسم کی وجہ سے زیادہ مزے دار لگی۔ لال بہادر کے بارے میں اس کا خیال بن گیا کہ یہ آدمی کام کر سکتا ہے۔ اور اسے رکھ لینا چاہیئے۔ اس نے کھڑگ بہادر سے پوچھا۔

"اس سے کیا بات طے کی ہے تم نے؟"

کھڑگ بہادر بولا۔

"صاحب ای چالیس روپیہ مانگتا ہے اور کھانا بھی۔ ہم تیس روپیہ بولا۔ ای بولا کہ صاحب کام دیکھ کر جو کہے گا وہ مان لے گا۔"

لال بہادر منیش کو پسند آ گیا تھا۔ صاف ستھرا اور سلیقے کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بولا۔

"ٹھیک ہے چالیس روپے دوں گا۔ مگر کوئی گڑبڑی نہ ہو۔"

کھڑگ بہادر بولا۔

"اس کا جمّا ہم لے گا صاحب۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگا۔ دارو بھی نہیں پیتا۔ بس اپنا کام سے کام۔"

منیش کو خوشی ہوئی۔ پہاڑی آدمی شراب نہیں پیتا۔ اس نے سنا تھا کہ پہاڑی لوگ گھر کی بنائی ہوئی یا بھٹی کی شراب پی کر شور ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ لال بہادر شراب نہیں پیتا تھا۔ مگر اچھی بات تھی۔ اسے خود شراب سے نفرت تھی۔ خوش ہوا کہ اس کی خواہش کے مطابق آدمی مل گیا۔ کچھ دیر میں اربند وساہا اور امل داس بھی آ گئے۔ اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جو باتیں ہوئیں ان سے منیش کو یقین ہو گیا کہ کرسیانگ کی زندگی اچھی رہے گی۔ اور وہ ہر طرح آرام سے اور خوش رہے گا۔

لال بہادر سیدھا اور اچھا آدمی تھا۔ کھانا بہت اچھا پکاتا تھا۔ اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ رات کے وقت اس نے سادہ کھانا پکایا مگر مزے دار۔ منیش تھکا ہوا تھا اور موسم بھی بدل گیا۔ تو وہ کمرہ بند کر کے بستر میں گھس گیا۔

صبح سویرے لال بہادر چائے لے کر آیا تو منیش نے دروازہ کھولا۔ لال بہادر نے سلام کیا۔ اور چائے کی ٹرے سامنے رکھ دی۔ سویرے سویرے ذرا ہلکی ہلکی ٹھنڈک میں چائے بہت مزے دار معلوم ہوئی۔ اسی وقت اس نے لال بہادر کو سمجھا دیا۔ کہ وہ ناشتہ کر کے نو بجے آفس چلا جائے گا۔ اور ایک بجے دن کو کھانا کھانے آئے گا۔ پھر چار بجے کے بعد چائے پیے گا۔ اور آٹھ بجے رات تک کھانا کھائے گا۔ لال بہادر نے اس کی ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔

"اچھا صاحب۔"

اسی وقت چوکیدار نے کمرے کے دروازے پر آکر کہا۔

"سلام صاحب۔ ہم اب جاتا ہے۔ ہمارا ڈیوٹی ختم ہوا پھر رات کو آئے گا۔"

منیش نے کہا۔

"اچھا اچھا ——"

چائے پی کر منیش غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں سے آنے کے بعد آفس جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ پھر اربندو ساہا اور امل داس بھی آگئے۔ اور وہ ناشتہ کرنے کے بعد ان دونوں کے ساتھ آفس چلا گیا۔ آفس کے سارے لوگوں سے ملا۔ باتیں کیں۔ اربندو ساہا اور امل داس

سے دیر تک باتیں کرتا اور کام کو سمجھتا رہا۔ کچھ لوگ ملنے آگئے۔ ان سے مل لیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ آفس میں لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا ہے۔ اس کے بعد لوگوں سے ملنا جلنا اور باتیں کرنا۔ بازار کا اُتار چڑھاؤ دیکھنا کام تھا اور ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی تھا فیکٹری تلی گوری میں تھی۔ اُس کی نگرانی بھی اس کے ذمہ تھی، لیکن فیکٹری کا مینجر بھی تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ کام دل چسپ تھا۔

آفس سے واپس آیا تو اُسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا بستر جھاڑ کر بچھایا ہوا تھا۔ دونوں کمبل تہہ کر کے رکھے تھے۔ کھڑگ بہادر نے ساری چیزوں کو اپنے خیال کے مطابق سلیقے سے رکھا تھا۔ مگر خود منیش نے سمجھا تھا کہ ٹھیک طریقے سے نہیں تھا۔ لیکن اب اس کی آدھی سے زیادہ چیزیں بڑے سلیقے کے ساتھ رکھی تھیں۔ اور آدھی چیزیں ایک طرف ــ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ساری کتابیں سلیقے کے ساتھ شلف میں رکھی تھیں۔ دونوں بکس جو پہلے سونے کے کمرے میں ایک طرف رکھے تھے، ان کو اٹھا کر پہلو والے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اُن میں سے کپڑے نکال کر بڑے سلیقے کے ساتھ وارڈروب میں رکھے تھے۔ سونے کے کمرے میں صرف ایک چھوٹی میز، اُس پر گلدان، ٹیبل لیمپ، کتابوں کے لئے ایک چھوٹا شلف اور ایک ہیٹر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی سلیقہ مند نے گھر کی ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھا تھا منیش بہت خوش ہوا۔ اتنا سلیقہ مند آدمی اس کو مل گیا تھا۔ ایسا نوکر تو سو روپے میں بھی سستا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اب اسے کسی قیمت پر بھی جانے نہیں دے گا۔

لال بہادر واقعی سلیقے والا آدمی تھا۔ صبح سویرے آجاتا، چائے بناتا، ٹرے لے کر آتا اور دروازے کو ہلکے سے کھٹکھٹاتا، منیش کمرے کا دروازہ کھول دیتا، تو وہ اندر آجاتا۔ چائے

کی ٹرے چھوٹی سی میز پر رکھ کر واپس آجاتا۔ اور باورچی خانے میں کام کرتا رہتا۔ منیش چائے پی کر غسل خانے میں چلا جاتا اور جب واپس آتا تو دیکھتا کہ لال بہادر چائے کی ٹرے لے جا چکا ہے۔

جب تک منیش نہا دھو کر تیار ہوتا اور کپڑے پہن کر آجاتا تو آٹھ بجے وہ ناشتہ لاکر کھانے کی میز پر رکھ دیتا۔ منیش ناشتہ کرکے ٹہلتا ہوا آفس چلا جاتا۔ اور ایک بجے لوٹ کر آتا تو کھانا تیار ملتا۔ کبھی کوئی بات دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اتنا اچھا نوکر مل جانا بڑی خوش نصیبی کی بات تھی۔

منیش کو کرسیانگ آئے ہوئے پندرہ دنوں سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھا ہر کام اپنے طور پر چل رہا تھا۔ دفتر یا گھر میں کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ جب آئینہ دیکھتا تو محسوس کرتا کہ کرسیانگ آکر اس کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ ہر روز آفس سے آنے کے بعد سائبان میں بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھتا اور کوئی ملنے آجاتا تو اس سے مل لیتا۔ یا پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو صحن میں جاکر ٹہلنے لگتا۔ یا کن چن چنگا کی چوٹی کو تکتا رہتا۔ یا پھر وادی میں پھیلے ہوئے چائے بگان کو۔ کبھی کبھی اربند وساہا اور رامل داس آجاتے تو دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ورنہ منیش اور اس کی کتابیں۔ وہ خود بھی تنہائی پسند تھا۔ لیکن کبھی کبھی تنہائی سے اکتا جاتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ یہاں کے موسم اور نظاروں میں اس کا کوئی شریک ہوتا۔ مگر یہ کیفیت دیر تک نہیں رہتی۔ وہ جلد ہی اپنی کتاب یا کن چن چنگا کے نظاروں میں کھو جاتا۔

منیش نیک آدمی تھا۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ مالی کو دن بھر کام کرنے کے لئے کل پچیس روپے ماہوار اور چوکیدار کو رات کے وقت مکان کی حفاظت کے لئے کل بارہ روپے ملتے ہیں۔ اسے جب معلوم ہوا تھا تو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اُس نے

دل میں سوچ رکھا تھا کہ ان دونوں کی تنخواہ بڑھوا کر رہے گا۔ اور اپنے طور پر دونوں کی اس طرح مدد کردی کہ دن کے وقت مالی کو اور رات کے وقت چوکیدار کو کھانا دینے لگا۔ اسے یہ بات عجیب سی لگتی تھی کہ کوئی اس کا کام کرے اور کھانا کھانے اپنے گھر جائے۔ لال بہادر کی طرح مالی اور چوکیدار بھی اس کا دم بھرنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کئی ڈپو منیجر رہ چکے تھے۔ انگریزی بھی اور ہندستانی بھی۔ لیکن کسی کا اتنا ہمدردانہ رویہ نہیں تھا۔

ایک دن صبح سویرے منیش کی آنکھ کھلی تو ایسا لگا کہ کمرے میں دھواں بھرا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر دیکھا۔ کہرا چھایا ہوا تھا۔ اتنا گہرا کہ پاس کی بھی کوئی چیز دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ لال بہادر چائے لے کر آیا۔ اس نے چائے پی اور گرم گون پہن کر باہر سائبان میں آگیا۔ کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر چیز جیسے دھوئیں کی تہوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ پاس کی بھی کوئی چیز صاف دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ موسم خراب تھا۔ ٹھنڈک بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن ناشتہ کرنے کے بعد وہ آفس چلا گیا۔ راستے میں اُسے نہ کوئی کار ملی اور نہ ٹرک۔ ایسے موسم میں آمد و رفت بند ہو جاتی تھی اسی کی طرح کچھ لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے اپنے ضروری کاموں کے لئے جارہے تھے۔ آفس میں سارے لوگ سکڑے سکڑائے بیٹھے تھے۔ بجلی کا بلب جل رہا تھا لیکن روشنی نہیں پھیل رہی تھی۔ کچھ پڑھنا لکھنا مشکل تھا۔ امل داس نے بتایا کہ گرمی کے موسم میں اکثر کہرا چھا جاتا ہے۔ لیکن اتنا گہرا نہیں۔ ایسا کہرا سال میں دو تین دن ہوتا ہے۔ اور جب ہوتا ہے تو سارے کام بند رہتے ہیں۔ کچھ دیر تو آفس میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ پھر امل داس نے اسے بتایا کہ ایسے میں کوئی کام تو ہوگا نہیں۔ اور رائے دی کہ گھر جا کر آرام کرے۔ اگر کوئی ضرورت ہوئی تو فون کرے گا۔ منیش کو امل داس کی رائے اچھی معلوم ہوئی۔ اس نے سوچا کہ آفس میں بیٹھے رہنے کا کوئی

فائدہ نہیں۔ کہرے کا پہلا تجربہ تھا۔ ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر آدمی ٹھنڈک سے اُکڑا جا رہا تھا۔
وہ گھر لوٹ آیا۔ راستہ اب بھی سنسان تھا۔ دو چار آدمی ملے، وہ بھی ضرورت کے مارے ہوں گے۔

گھر پہنچ کر منیش دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ روشنی جل رہی تھی۔ اور ایک جوان لڑکی اس کی کتابوں کو شلف میں رکھ رہی تھی۔ وہ چونک اٹھا اور بولا۔

"کون ہے؟"

لڑکی چونک پڑی۔ اس نے پلٹ کر گھبرائی نظروں سے اُس کو دیکھا منیش نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

لڑکی بولی۔

"کانچی۔"

"کانچی؟"

منیش نے دوسرا سوال کیا۔

"مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی ذرا دیر سر جھکائے کھڑی رہی پھر بولی۔

"بُوا (باپ) بولا ہے، صاحب کا سب چیز ٹھیک کر دو۔"

"کون ہے تمہارا بوا۔ اور تم کو کام کرنے کو کیوں بولا؟"

منیش نے سوال کیا۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"ببرچی۔ لال بہادر۔"

منیش چپ ہو گیا۔ لڑکی کمرے سے باہر چلی گئی۔ کہرے کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف

نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر منیش کو اندازہ ہو گیا کہ لڑکی گوری چٹی اور دُبلی پتلی ہے۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر لال بہادر کو آواز دی۔ وہ آیا اور خود ہی بولا۔

"صاحب۔ ہمارا بیٹی ہے۔ کانچی۔ گھر میں بے کار بیٹھی رہتی ہے۔ ہم اس کو بولا۔ آکر صاحب کا سامان ٹھیک کر دیا کرو۔"

منیش نے پوچھا۔

"ہر روز یہی کمرہ درست کر دیتی ہے؟"

"ہاں صاحب۔"

لال بہادر بولا۔ منیش نے کہا۔

"پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

لال بہادر نے جواب دیا۔

"صاحب آپ ناشتہ کر کے آفس چلا جاتا ہے تو وہ اپنا گھر سے کھانا کھا کر آتا ہے۔ آپ کا سامان درست کر دیتا ہے۔ اور شام سے پہلے اپنا گھر جا کر کھانا پکاتا ہے۔ پھر آتا ہے تو بہرچی کھانا میں رہتا ہے۔"

منیش کو لال بہادر کی یہ بات عجیب سی لگی۔ اور وہ بولا۔

"مگر تم اس سے میرا کام کیوں لیتے ہو۔ وہ نوکر تو نہیں۔"

لال بہادر بولا۔

کوئی بات نہیں صاحب۔ گھر پہ بھی اس کو کوئی کام نہیں۔ تھوڑا سا بگان ہے۔ اس میں ہم ترکاری لگا دیتا ہے۔ اس میں پانی دیتا ہے۔ اور بس۔ آپ اکیلا ہے۔ یہ چیز (چیز) کو ٹھیک سے

رکھنے والا کوئی نہیں۔ ہم اس کو بول دیا۔ تم ٹھیک کر دیا کرو۔ اور وہ آکر ٹھیک کر دیتا ہے۔"

منیش بولا۔

"مگر کسی سے مفت کام لینا تو ٹھیک نہیں۔"

لال بہادر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بولا۔

"صاحب ہم پہاڑی لوگ پیسہ کا واسطے نہیں مرتا۔ آدمی کے واسطے مرتا ہے۔ جو ہم لوگ کا جرا سا کھیال کرتا ہے اس کا واسطے جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ آپ کا واسطے ہم سب سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ آپ سب کو اتنا مانتا ہے۔ کسی کو کوئی کرا بات نہیں بولتا۔ کھڑگ بہادر ہمارا ناتا کا بھائی ہے۔ بولا۔ اس کا بھائی بجرنگ بہادر کلکتہ سے اس کو لکھا ہے۔ صاحب بہت اچھا ہے۔ پھر وہ ہم کو تیس روپیہ دینا مانگتا تھا۔ آپ چالیس روپیہ بول دیا۔ ہر دن پوچھتا ہے۔ کھانا کھایا۔ آپ اتنا کھیال کرتا ہے تو ہم کیسے نہیں کرے گا صاحب۔"

منیش کو لال بہادر پہلے ہی سے پسند تھا۔ اس کی سیدھی سادھی باتیں اور پسند آگئیں۔ وہ بولا۔

"تم اس سے کام لیتے ہو تو اس کا مہینہ باندھ دو اور اس کا کھانا یہاں پکاؤ۔"

لال بہادر بولا۔

"نہیں اس کا جرورت نہیں صاحب۔ گھر پہ کوئی نہیں اکیلا رہتا ہے۔ ہمارا پاس آجاتا ہے تو اس کا جی لگتا ہے۔ آپ کا اکھبار لے کر پڑھتا ہے۔ کتاب پڑھتا ہے۔"

منیش نے تعجب سے پوچھا۔

"اخبار پڑھتی ہے، کتاب پڑھتی ہے؟"

"ہاں صاحب۔ اُس کو پڑھنے کا بہت سوک (شوق) ہے۔"

لال بہادر نے جواب دیا۔ منیش کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی ساری کتابیں انگریزی میں تھیں۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں پڑھا ہے کانچی نے۔۔؟"

لال بہادر نے تھکے ہارے انداز میں کہا۔

"ہم نہیں پڑھایا صاحب۔ ہم گریب آدمی کہاں پڑھاتا۔ ہم دارجلنگ میں واٹسن صاحب کا پاس تھا۔ اس کا بیٹی تھا روزابے بی۔ کانچی کا ماں اس کا آیا تھا۔ کانچی اس کا ساتھ کھیلتا تھا۔ میم صاحب کانچی کو بہت مانتا تھا۔ روزابے بی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور کھیل میں کانچی کو بتاتا تھا۔ کیا پڑھا۔ کانچی سب یاد کر لیتا تھا۔ میم صاحب کھس (خوش) ہوا۔ اور اس کو بھی اسکول میں بھرتی کرا دیا۔ روزابے بی کا اسکول میں کھالی بابا لوگ پڑھتا تھا۔ پھر روزابے بی بڑا ہوا تو بلایت چلا گیا۔ کانچی دارجلنگ میں پڑھتا رہا۔ سب کھرچا میم صاحب دیتا تھا۔ کانچی کو بہت مانتا تھا۔ اپنا پاس رکھتا تھا۔ اُس کو انگریجی میں بات کرنا سکھاتا تھا۔ صاحب اور میم صاحب ہم سب کو اپنا بچہ جیسا مانتا تھا۔ ہم بیس سال کا عمر سے اُس کا پاس تھا۔ صاحب اور میم صاحب ہمارا بیاہ کرایا۔ کانچی کا نانا واٹسن صاحب کا اردلی تھا۔ روزابے بی سب سے چھوٹا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا پہلے بلایت گیا۔ میم صاحب کانچی کا ماں کو بہت مانتا تھا۔ کانچی کا ماں مر گیا تو میم صاحب بہت رویا۔ اور کانچی کو اپنا پاس رکھا۔ کانچی اسکول جاتا تھا۔ گھر پر میم صاحب اُس کو پڑھاتا تھا۔ صاحب اور میم صاحب بہت کتاب پڑھتا تھا۔ کانچی بڑا ہوا تو اس کو بھی اپنا کتاب پڑھنے کو دیتا تھا۔"

لال بہادر چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔

"کوئی پیسہ دینے کا ضرورت نہیں صاحب۔ کانچی آپ کا کام خوشی سے کرے گا۔"

منیش نے سوچا۔ اب زیادہ زور دے گا تو لال بہادر بُرا مان جائے گا۔ یہ سیدھے سادھے پہاڑی لوگ ذرا سی بات میں دل چھوٹا کر لیتے ہیں۔ اُس نے بات بدل دی اور بولا۔

"آج بہت ٹھنڈا ہے لال بہادر۔"

لال بہادر بولا۔

"کہرا لگتا ہے تو بہت ٹھنڈا پڑتا ہے صاحب۔"

منیش نے کہا۔

"چائے بنا کر لاؤ۔"

لال بہادر چلا گیا۔ منیش سوچنے لگا۔ یہ کتنا سیدھا اور سچا آدمی ہے۔ ڈانسو صاحب مانتا تھا، اس کی میم مانتی تھی تو غلط نہیں۔ جو بھی اسے جان لے گا وہ ضرور مانے گا۔ منیش خود بھی نیک آدمی تھا۔ اچھے اور بُرے آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر کسی میں کوئی اچھائی نظر آتی تو اس کی طرف اس کا دل جھک جاتا تھا۔ اور اگر کسی میں بُرائی نظر آتی تو اس سے دور رہتا تھا۔ اُسے یہ سچ مچ بُرا معلوم ہوا تھا کہ کانچی اس کا کام مفت کرتی ہے۔ اُسے یہ بھی بُرا لگا کہ کانچی سے لال بہادر کام لیتا ہے اور اُسے کچھ دینا نہیں چاہتا۔ یہ بات اُس کے خیال میں انصاف کے خلاف تھی۔ اُس نے سوچا کہ اُس کا بدلہ اُسے ضرور ملنا چاہئے۔ اور وہ ضرور دے گا۔

تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ چائے کانچی لائی۔ چھوٹی میز پر اُس نے چائے کی ٹرے رکھی۔ پھر پیالی میں اُنڈیل کر پیالی اُس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"کوئی چیز خراب نہیں ہوگی۔ ہر چیز حفاظت کے ساتھ رکھتی ہوں۔"

کانچی کی زبان بہت صاف تھی۔ لال بہادر بتا چکا تھا کہ کانچی پڑھی لکھی ہے اور انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اُس نے انگریزی میں پوچھا۔

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

کانچی نے انگریزی میں جواب دیا۔

"میٹریکولیشن تک پڑھ سکی۔ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر میم صاحب بیمار ہوگئیں اور مرگئیں۔ صاحب نوکری چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ میں چاہتی تھی، اور میم صاحب بھی چاہتی تھی کہ ایم اے کروں۔ مگر بوا کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ پڑھاتا۔"

کانچی کی انگریزی بہت صاف تھی۔ لہجہ انگریزوں جیسا تھا۔ منیش کو حیرت ہوئی۔ پھر سمجھ میں بات آگئی کہ انگریز عورت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس سے انگریزی میں باتیں کرتی تھی۔ اور اس سے بولنا سیکھا تھا۔ کانچی بولی۔

"تمہارے پاس اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ اس کی اجازت دے دو۔ میں کتابیں خراب نہیں کروں گی۔"

"جو کتاب پڑھنا چاہو لے لیا کرو۔"

منیش نے جواب دیا۔ پھر لال بہادر آگیا اور کانچی چلی گئی۔ منیش نے لال بہادر سے پوچھا۔

"اُس کا بیاہ ہوگیا ہے؟"

لال بہادر منیش کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

"نہیں صاحب۔ کہاں کرے گا۔ بات تو بہت آیا۔ مگر کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں ملا۔

اس کو کوئی آدمی پسند نہیں آیا۔ میم صاحب ہم سے ہاتھ پکڑ کر جبان (زبان) لیا ہے، اس کا بیاہ اس کا پسند سے کرنا۔ پڑھا لکھا آدمی ہم لوگ میں نہیں ملتا۔ ہم کا کرے گا صاحب؟"

بات صاف تھی، پہاڑی لوگ غریب تھے۔ ان میں تعلیم نہیں تھی۔ اور کانچی پڑھ لکھ کر اور انگریز عورت کے ساتھ رہ کر بدل چکی تھی۔ منیش نے سوچا۔ یہ تو اس کے ساتھ بھلائی نہیں، برائی ہو گی۔ لال بہادر بولا۔

"صاحب ہمارا کسمت (قسمت) کھراب تھا۔ صاحب اور میم صاحب ہم کو بہت مانتا تھا اپنا بچہ جیسا۔ میم صاحب بولتا تھا۔ کانچی کو ایم اے پڑھائے گا۔ مگر کا کرے گا صاحب۔ میم صاحب بیمار ہو گیا۔ بہت دوائی ہوا۔ مگر نہیں بچا۔ مر گیا۔ صاحب کو بڑا دکھ ہوا۔ صاحب نوکری چھوڑ کے بلایت چلا گیا۔ جانے لگا تو ایک ہجار روپیہ ہم کو دیا۔ اور ایک ہجار کانچی کا بیاہ کا واسطے۔ کانچی کو الگ روپیہ دیا۔ ہمارا اور کانچی کا پاس سب کپڑا صاحب اور میم صاحب کا دیا ہوا ہے۔ ہم سب اب تک کوئی کپڑا کھرید نہیں کیا۔ کہاں سے کھریدے گا صاحب دامی کپڑا۔"

لال بہادر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اور آواز بیٹھ گئی۔ منیش اس کا چہرہ تکتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ یہ کتنا نیک، سچا اور محبت کرنے والا آدمی ہے۔ ورنہ آج کل کون نوکر نوکری چھوڑنے کے بعد مالک کو یاد رکھتا ہے۔ لال بہادر کھنکھارا اور گلا صاف کر کے بولا

"صاحب۔ ہم کو دارجلنگ میں بہت نوکری ملتا تھا۔ مگر ہم نہیں کیا۔ ایسا مالک کہاں ملے گا۔ کبھی کوئی بڑا بات نہیں بولا۔ مگر آپ کا پاس ہم بہت کھس ہے صاحب۔"

لال بہادر نے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور بولا۔

"آج جاڑا ٹھنڈا ہے صاحب، چائے لائے گا۔"

منیش بھی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ اور چائے پینا چاہ رہا تھا۔ وہ خود لال بہادر سے چائے کے لئے کہتا لیکن صرف اس لئے نہیں کہہ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کیا سمجھے۔ لال بہادر جینٹ باتی ہو گیا تھا اور جب اس نے پوچھا۔ تو منیش نے ہاں کہنے کو گردن ہلا دی۔ لال بہادر چلا گیا۔ اس کی باتوں کا منیش پر گہرا اثر ہوا۔ سچ مچ اُسے اپنے پہلے مالک واٹسن صاحب سے محبت تھی۔ واٹسن صاحب ضرور اچھا آدمی ہوگا اور اس کے ساتھ محبت اور مہربانی کے ساتھ پیش آتا ہوگا۔ دیر تک وہ سوچتا رہا۔ لال بہادر کیسا آدمی ہے۔ کانچی کیسی لڑکی ہے۔ لال بہادر جتنے دنوں سے کام کر رہا تھا، اور جتنا اُسے سمجھ سکا تھا، وہ اچھا آدمی تھا۔ کوئی کام اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جو منیش کو ناپسند ہوا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی اس نے محسوس کیا تھا کہ لال بہادر کو خود ہر بات کا اتنا زیادہ خیال رہتا ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ منیش نہ جانے کب تک اپنے خیالوں میں ڈوبا رہتا۔ مگر لال بہادر چائے لے کر آ گیا اور بولا۔

"چائے لے آیا صاحب۔"

منیش بولا۔

"تم ہی بنا کر دو۔"

لال بہادر پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

"صاحب۔ کانچی کو کام کرنے دو۔ اس کا من بہلے گا۔ گھر میں اکیلا بیٹھا رہے گا تو اس کا من کھراب ہوگا۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اور دوسر الڑکی سب سے بھی نہیں ملتا۔ کیا بات کرے گا کوئی پڑھا لکھا لڑکی نہیں۔ کہیں جانا آنا نہیں ...."

لال بہادر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اُسے دونوں باپ بیٹی سے ہمدردی ہو گئی۔ واٹسن صاحب

کی میم مر گئی۔ اور وہ چلا گیا تو ان دونوں کی قسمت بدل گئی۔ وہ نرمی کے ساتھ سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اچھا اس سے کام لو۔ لیکن لال بہادر کسی سے مفت میں کام لینا اچھا نہیں۔ تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتے۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ معلوم نہیں تم اس کو ناشتہ اور چائے بھی دیتے ہو یا نہیں۔"

لال بہادر بولا۔

"صاحب اپنا حصہ میں سے دیتا ہے۔"

منیش نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اپنے حصے میں سے دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ کام کرتی ہے تو اس کو ناشتہ اور کھانا دو۔ ہم واٹسن صاحب کے اتنا بڑا آدمی نہیں ہے۔ وہ بہت بڑی کمپنی کا منیجر تھا اور بڑا صاحب۔ ہم تو ابھی کام شروع ہی کیا ہے۔ پھر بھی کانچی کو کھانا اور ناشتہ ضرور دو۔ وہ بہت محنت سے اور ساری چیزوں کو بہت اچھی طرح رکھتی ہے۔"

لال بہادر بولا۔

"آپ بول دیا ہے صاحب تو اس کو کھانا اور چائے دے دے گا۔"

"ہاں ضرور دینا۔ نہیں تو اس کو کام بھی مت کرنے دو۔ ہم کو کسی سے مفت میں کام لینا پسند نہیں ہے۔"

منیش چائے پی کر بستر میں گھس گیا اور کمبل کھینچ کر لیٹ رہا۔ ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ کہر اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہیٹر جل رہا تھا، مگر کمرے میں ٹھنڈک تھی۔ منیش دیر تک کانچی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بڑھ کر وہ لال بہادر کے لئے ایک مستقل مسئلہ بن گئی تھی۔ اگر دوسری پہاڑی لڑکیوں کی طرح وہ ان پڑھ ہوتی تو اب تک اس کا بیاہ ہو چکا ہوتا اور وہ اپنا گھر آباد کر چکی ہوتی۔

مگر اب مشکل ہو رہی تھی۔ اور کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ آگے بھی کوئی پڑھا لکھا پہاڑی مل سکے گا یا نہیں۔ منیش کو اپنے اوپر ہنسی آ گئی۔ کچھ بھی ہو۔ مگر وہ کانچی کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہا تھا۔ آج لال بہادر اس کے پاس ہے۔ کل کوئی اور اچھی نوکری مل جائے گی۔ وہ چلا جائے گا۔ پھر وہ کہاں اور لال بہادر اور کانچی کہاں۔ اور یہ ایسا مسئلہ تھا کہ وہ لال بہادر کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سو جانے کی کوشش کی۔ مگر نیند نہیں آئی۔ کلکتہ میں دوستوں نے اُسے ٹھیک ہی بتایا تھا کہ جب پہاڑ پر ٹھنڈک پڑتی ہے تو ہڈی میں گھس جاتی ہے۔ ٹھنڈک بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ بستر کے اندر سکڑتا ہی جا رہا تھا۔ ہیٹر کی گرمی کافی نہیں تھی۔ یکایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ منیش نے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ لال بہادر ٹوکری میں کچھ لے کر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کانچی تھی۔ کہرا اتنا گہرا تھا کہ دو میں سے کسی کی بھی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلب سے نکلنے والی روشنی دھند میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہوا کہ کانچی جوان اور اچھی شکل کی ہے۔ لال بہادر نے ٹوکری لا کر اس کے پلنگ کے پاس رکھ دی۔ اس میں کوئی چیز رکھی تھی۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی۔ کانچی نے جلدی سے اٹھا کر اس کے بستر کے نیچے چار جگہوں پر ایک ایک رکھ دی اور ہیٹر کو بھی نزدیک کر دیا۔ منیش کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور اس نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"گرم اینٹیں ہیں۔ ان سے تمہارا بستر گرم ہو جائے گا۔ اور آرام سے سو سکو گے۔"

منیش بولا۔

"اس کی ضرورت تو نہیں۔"

کانچی بولی۔

تم نے۔ بہت ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ کون خیال کرے گا تمہارا۔ میم صاحب بھی یہاں نہیں ہے۔"

منیش کو ہنسی آگئی۔ اس کا بیاہ ہوا ہی نہیں تھا۔ بات کہی جگہ سے چل رہی تھی۔ مگر طے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کانچی اس کے بستر کے نیچے کپڑے میں لپٹی ہوئی گرم اینٹیں رکھتی رہی۔ اس نے دیکھا۔ کانچی کے گالوں پر سیب جیسی سرخی تھی جو عام طور پر پہاڑی لڑکوں اور لڑکیوں کے گالوں پر ہوتی ہے۔ کانچی بولی۔

"اب بستر گرم رہے گا اور ٹھنڈ نہیں لگے گی۔"

کانچی لال بہادر کے ساتھ چلی گئی۔ وہ پھر بستر میں گھس گیا۔ بستر پہلے سے گرم تھا۔ وہ بستر میں گھسا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ جیسے ہر کام سردی کی وجہ سے رک گیا تھا۔ کہرے نے پہاڑی علاقے کی ساری زندگی کو اپنے اندر لپیٹ لیا تھا۔ وہ سو کر اٹھا۔ پھر شام کو چائے پی کر بستر میں گھس گیا۔ پھر رات کو کھانا کھا کر بستر میں گھس گیا۔ ٹھنڈک ایسی سخت تھی کہ اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اٹھ کر بیٹھنے اور کتاب پڑھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ کانچی نے چار اینٹیں گرم کر کے اس کے بستر کے نیچے رکھ دی تھی اور اس کا بستر گرم ہو گیا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے پھر بستر ٹھنڈا ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر ٹھنڈک ایسی ہی رہی تو ایک ہیٹر اور خریدنا ہوگا۔ بستر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جاڑا کاٹ کھائے گا۔

دوسرے دن بھی کہر اچھایا رہا۔ وہ بستر میں سکڑا پڑا رہا۔ بستر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بستر میں گھسا لیٹا رہا۔ صبح کی چائے کانچی لائی۔ ایک پیالی میں گرم پانی بھی لائی چائے کی ٹرے چھوٹی میز پر رکھ کر گرم پانی کی پیالی اسے دی۔ منیش نے کلی کی۔ اور چائے پی لی۔ کانچی ٹرے لے کر چلی گئی۔ منیش کو بستر کے اندر سے نکلنا جبر ہوا۔ لیکن اٹھ کر غسل خانے کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانچی ناشتہ لے کر آئی۔ تو منیش نے پوچھا۔

"میرا کمرہ تم روز درست کر دیتی ہو؟"

وہ مسکرائی۔

"ہاں۔ بڈا بولا۔ صاحب کے پاس دوسرا آدمی نہیں۔ اتنا کام تم کر دیا کرو۔

اور میں نے یہ کام شروع کر دیا۔

منیش بولا۔

"مگر تم کام کیوں کرتی ہو۔ تم تو نوکر نہیں ہو۔ تم کو پیسہ نہیں ملتا۔"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"آدمی سارے کام پیسے کے لیے ہی تو نہیں کرتا۔ یہاں تمھارا اور کون ہے۔ اگر میں نہیں کروں تو کون کرے گا؟"

منیش کو محسوس ہوا کہ وہ احسان جتانا چاہتی ہے۔ اور وہ کسی کا بھی احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"میں خود کر لوں گا۔"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"گھر مرد سے نہیں سنبھلتا۔ گھر کو عورت ہی اچھا رکھ سکتی ہے میم صاحب کو لے آؤ۔"

منیش مسکرایا اور بولا۔

"ابھی میرا بیاہ نہیں ہوا ہے۔"

کانچی گمبھیر ہو کر بولی۔

"جلدی بیاہ کر لو۔ اکیلے رہو گے تو بہت تکلیف ہو گی۔ تمہاری چیزوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"تم۔"

منیش کی زبان سے نکل گیا۔ لیکن جیسے اس کے سارے بدن پر برف گر گئی۔ نہ جانے کانچی کیا سمجھے۔ شاید برا مان جائے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم تو سارا کام کر ہی دیتی ہو۔"

منیش کا خیال غلط نکلا۔ کانچی نے کوئی برا اثر نہیں لیا۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"بیاہ کر لو۔ میم صاحب کو لے آؤ۔ یہاں اس کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

منیش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ چپ رہا۔ کانچی بولی۔

"بیاہ کیوں نہیں کرتے۔ اتنا روپیہ کماتے ہو؟"

منیش چپ رہا۔ اُسے خیال ہوا کہ کانچی سے اُسے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اور نہ اُسے موقع دینا چاہئے۔ آزاد ماحول میں بڑھی ہے۔ اُسے کسی مسئلے پر بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں۔ اگر کسی نے اس سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا۔ آفس کے سارے لوگ جانتے ہیں کہ اس کا بیاہ نہیں ہوا ہے۔ اور جائے لگان کا ماحول بہت گندا اور بدنام ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرایا اور سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ ایک بات اس کے دماغ میں آئی۔ اس نے سوچا کہ لال بہادر آئے گا تو اس سے کہہ دے گا کہ کانچی آئے تو باورچی خانے میں رہے۔ اور جب وہ آفس چلا جائے تو اس کے کمرے میں کام کرنے کو آئے۔ اور کام کر کے چلی جایا کرے۔ پھر اسے خیال آیا کہ لال بہادر کیا سمجھے گا۔ کانچی کا دل چھوٹا ہو جائے گا۔ سوچے گی کیسا آدمی ہے۔ میں تو اتنا خیال کرتی ہوں۔ سارے کام کر دیتی

ہوں۔ اور یہ آدمی سامنے آنے دینا بھی پسند نہیں کرتا، خود منیش کے دل کو چوٹ لگی۔ لیکن اس کی الجھن باقی رہی۔

منیش دن بھر بستر میں گھسا پڑا رہا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ باہر نکلے اور موسم کا رنگ دیکھے۔ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ اہل داس نے فون پر کہہ دیا تھا کہ آفس میں کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اور اربندو ساہا کسی چائے کے باگان میں گیا تھا تو اسے موسم کی خرابی کی وجہ سے رک جانا پڑا۔ اہل داس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی ضروری کاغذ آگیا تو بھیج دے گا۔ وہ چپ چاپ بستر میں گھسا پڑا رہا۔ جیسے اُسے نیند آگئی تھی اور وہ سو رہا تھا۔ اور کانچی اس کے کمرے میں کام کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ اُسے دور رکھا جائے۔ بے جھجک نہ ہونے دیا جائے۔ وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اور کانچی سارے کام کر کے چلی گئی۔ اُس سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

شام کے وقت لال بہادر چائے لے کر آیا۔ کانچی باورچی خانے میں تھی۔ منیش نے اسے سمجھا کر کہا۔

"لال بہادر، تم کانچی سے مفت میرا کام لیتے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ اگر تم اسے پیسہ نہیں دیتے تو اُسے میرا کام بھی نہیں کرنا چاہئے۔"

لال بہادر بولا۔

"صاحب۔ تھوڑا دیر کام کرتی ہے۔ اس کا پیسہ کیا لے گی۔ اس کو کھانا ناشتہ دینے کو تو آپ بول دیا ہے۔ اتنا بہت ہے۔"

منیش کو پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ بات لال بہادر سے نہیں کہنی چاہئے تھی۔ مگر کانچی کو دور رکھنا چاہتا تھا۔ صرف مصلحت کی بنا پر۔ ورنہ اسے کانچی سے باتیں کرنے میں لطف آتا تھا۔

وہ دل چسپ باتیں کرتی تھی۔ اور بڑی بے باکی کے ساتھ۔ آزادی کے ساتھ ہر مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کر دیتی تھی۔ مگر وہ بے پرواسی تھی۔ اس سے میل جول رکھنے میں بدنامی پھیل سکتی تھی۔ اور بدنامی مول لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

منیش چائے پی رہا تھا کہ اربندو ساہا اور امل داس آ گئے۔ دونوں گرم کوٹ اور اس پر اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ منیش نے دونوں کو کمرے میں ہی بلا لیا۔

اربندو ساہا نے آتے ہی کہا۔

"بہت جاڑا ہے۔ سارا کام ٹھپ ہے۔ ہم کل ہی آ گیا تھا۔ گھر سے باہر نکلنے کو ہمت نہیں ہوا"

لال بہادر جلدی سے چائے بنا کر لے آیا۔ منیش ڈرا کہ کہیں اس وقت کانچی نہ آ جائے۔ اس کو دیکھ کر یہ لوگ کیا سوچیں گے۔ کانچی جوان تھی اور خوبصورت تھی مگر وہ نہیں آئی۔ اربندو ساہا اور امل داس باتیں کرتے رہے۔ دونوں نے بتایا کہ کئی برسوں کے بعد ایسا کہاسا لگا ہے کہ دن کو ٹارچ جلا کر چلنا پڑے اور ٹھنڈک اتنی کہ بستر سے باہر نکلنا بھی جبر ہو۔ پھر اربندو ساہا اور امل داس میں بحث ہوئی کہ دوسرے دن موسم کیسا رہے گا۔ امل داس کہتا تھا کہ موسم سدھر جائے گا۔ اور اربندو ساہا کہتا تھا کہ موسم زیادہ خراب ہو جائے گا۔ منیش نے سوال کر دیا۔

"مئی کے مہینے میں یہ حال ہے۔ تو دسمبر جنوری میں کیا حال ہو گا۔"

امل داس بولا۔

"ٹھنڈا تو ہوتا ہے۔ مگر موسم اتنا خراب نہیں ہوتا۔ کہاسا نہیں ہوتا۔"

اربندو ساہا نے سوال کر دیا۔

"آپ نے وقت کیسے کاٹا۔ آفس بھی نہیں گئے۔"

منیش بولا۔

"اچھا وقت کٹ گیا۔ چپ چاپ بستر میں پڑا رہا۔ اور کرتا بھی کیا۔ بستر سے نکلنے کی ہمت ہی نہیں۔ کتاب پڑھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ ویسے اور دن تو بہت اچھا کٹتا ہے۔ کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ جب کتاب نہیں پڑھتا تو کن چن جنگا کی چوٹی کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور جب بھی دیکھتا ہوں، تو نیا لطف آتا ہے۔ بڑا سکون ملتا ہے۔ اور جی نہیں چاہتا کہ ادھر سے نظر ہٹاؤں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کلکتہ کی تیز بھاگتی ہوئی زندگی کے بعد ذرا آرام لینے کا موقع مل گیا ہے۔"

امل داس بولا۔

"پھر بھی اکیلے رہنا کٹھن کام ہے۔ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، دوست احباب ـــ اپنا پرایا۔"

منیش نے فوراً جواب دیا۔

"کتابوں سے اچھا کوئی دوست نہیں"

منیش کو شک ہوا کہ کہیں امل داس نے کانچی کو دیکھا تو نہیں۔ آفس میں کام کرنے والے اپنے افسروں کی کمزوریاں جاننا چاہتے ہیں۔ تاکہ افسروں کو اپنے دباؤ میں رکھ سکیں۔ اور وہ سختی نہ کرے۔ منیش نے کہا۔

"نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میں عادی ہو گیا ہوں ـــــ یہاں کوئی لائبریری ہے یا نہیں؟"

"یہاں لائبریری ہے، مگر چھوٹی اور بنگلہ کتابیں زیادہ ہیں، دارجلنگ میں بڑی لائبریری ہے۔ کلب میں وہاں میرا بھائی لائبریرین ہے۔ آپ جو کتابیں چاہیں گے مل جائے گی۔"

"کلب کا ممبر بن جاؤں گا۔ کتابیں لانے کے بہانے سیر بھی ہو جایا کرے گی۔"

منیش نے جواب دیا۔ اربندو ساہا نے کہا۔

"موسم سدھر جائے تو چائے کے باغانوں میں بھی جانا ہوگا۔ سب سے ملتے جلتے رہنا ضروری ہے۔"

امل داس بولا۔

"دارجلنگ کلب میں سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ سب سے ملتے رہنا ضروری ہے۔ اگلے اتوار کو موسم اچھا رہے تو دارجلنگ چلیے۔"

اربندو ساہا بولا۔

"میں کل سب کو خط لکھ دیتا ہوں۔ اتوار کے دن سب کو دارجلنگ کلب میں بلاتا ہوں۔"

منیش بولا۔

"سب سے ملنا تو ضروری ہے۔ ویسے میں......"

اربندو ساہا نے جواب دیا۔

"سارا انتظام میں کر لوں گا۔"

اربندو ساہا اور امل داس چلے گئے۔ منیش کے دل میں کھٹک باقی رہی۔ کہیں ان دونوں نے کانچی کو دیکھ نہ لیا ہو۔ لال بہادر چائے کا برتن لینے آیا تو اس نے پوچھا۔

"کانچی کہاں ہے؟"

لال بہادر نے جواب دیا۔

"صاحب اُو اپنا گھر میں ہے۔ سویرے گیا ہے تو نہیں آیا۔ ہم گھر گیا تھا تو بولا تھا۔ اب وہ نہیں آئے گا۔ آپ ہم سے جو بولا تھا اُو سن لیا۔"

منیش کو اطمینان ہوا کہ امل داس اور اربند و ساہا نے کانچی کو نہیں دیکھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے لال بہادر سے باتیں کیوں کیں۔ کانچی نے سن لیا اور اب وہ رنجیدہ ہے۔

دوسرے دن موسم سُدھر گیا۔ منیش ناشتہ کرکے آفس چلا گیا، اور وہاں کام کرتا رہا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے آیا۔ تو ساری چیزیں ویسی ہی اِدھر اُدھر پڑی تھیں، جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ خاص کر کپڑے اور کتابیں۔ اُسے عجیب سا لگا اور لال بہادر کی بات بھی یاد آگئی۔ کانچی اب نہیں آئے گی۔ منیش نے کتابیں اکٹھا کر کے رکھیں۔ لیکن اُسے محسوس ہوا کہ کام آسان نہیں۔ گھر پر تو اس کے سارے کام چھوٹی بہن کر دیا کرتی تھی۔ اس نے محسوس کیا اور سوچا کہ اگر سچ مچ کانچی نے آنا چھوڑ دیا تو اُسے تکلیف ضرور ہوگی۔ لیکن اس سے زبردستی کام نہیں لیا جا سکتا۔ لال بہادر نے کھانا لاکر میز پر رکھا۔ وہ کھاتا اور سوچتا رہا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ کھانا کھا کر آفس چلا گیا۔ اور شام کے وقت واپس آیا۔ تو بھی کانچی نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں پچھتایا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔

اتوار کے دن وہ ناشتہ کر کے بیٹھا تھا کہ اربند و ساہا اور امل داس آ گئے۔ اربند و ساہا نے اُسے بتایا کہ کھانا دارجلنگ کلب میں کھانا ہے۔ وہاں اُن نے کئی چائے بگانوں کے مینجروں کو کلب میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ اُن سے وہاں ملاقات ہو جائے گی۔ باتیں ہوں گی اور سیر بھی ہو جائے گی۔ منیش خوش تھا کہ اُسے آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کرسیانگ سے باہر نہیں گیا تھا۔ دوسرے کلب میں لائبریری کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ وہاں دیکھے گا کہ کیسی

اور کتنی کتابیں ہیں۔ مسٹر اور مسز گپتا سے ملے گا۔ وہ دونوں اس سے ملنے کو آچکے تھے لیکن یہ نہیں جا سکا تھا۔ وہ دونوں کے ساتھ دارجلنگ چلا گیا اور لال بہادر سے کہتا گیا کہ رات کا کھانا واپس آکر گھر پر کھائے گا۔

دارجلنگ میں کافی چہل پہل تھی۔ ہر طرف لوگ ٹہلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ دو دن بعد کہاسا ختم ہوا تھا تو لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور چھٹی کا دن تھا ــــ منیش کلب پہنچا۔ وہاں بھی بھیڑ تھی۔ کلب انگریزوں کا تھا اور خاص خاص ہندستانیوں کو ممبر بنایا جاتا تھا۔ منیش سے پہلے کرسیانگ ڈپو کا منیجر تارک ناتھ بسواس تھا، اور بڑی کوشش کے بعد ممبر بنا تھا۔ منیش کو کلب کا ممبر بننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وہاں اچھی لائبریری تھی اور اس سے اُسے دلچسپی تھی۔ اربندو ساہا نے جن لوگوں کو دعوت نامہ بھیجا تھا وہ سب آگئے تھے۔ منیش ان سب سے ملا اور باتیں ہوئیں۔ سب پینے والے تھے۔ سب نے کھانے سے پہلے شراب پی اور ایسی باتیں کرتے رہے، جن سے منیش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُن میں مسٹر مارٹن بھی تھا اور مسٹر مارشل بھی۔ دونوں چائے بگانوں کے منیجر تھے ــ منیش کی کمپنی ان سے چائے کی پتیاں خریدتی تھی۔ مارٹن پہلے فوج میں تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ اور وہ فوج کے کام کا نہیں رہ گیا تھا۔ لنگڑا کر چلتا تھا۔ اُس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ جب تک رہا شراب اور عورت کی باتیں کرتا رہا۔ مارشل کم بولتا تھا۔ لیکن جب تک رہا وہ مارٹن کی باتوں سے دلچسپی لیتا رہا۔ مسٹر بروک بالکل چپ تھا، وہ چپ بیٹھا اپنا گلاس ہاتھ میں لئے ہلکی ہلکی چسکی لیتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ مارٹن نے منیش پر اعتراض کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ شراب بھی نہیں پیتے تو یہاں آنے کا کیا فائدہ؟ نوکری تو دوسری بھی مل سکتی تھی منیش کو کلب کا ماحول بالکل پسند نہیں آیا۔ دوسرے لوگ بھی آئے،

تو اُن کو شراب سے زیادہ دل چسپی تھی۔ کچھ لوگوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عورتیں بھی سب سے آزاد از مل رہی تھیں۔ اس نے ایک ہندستانی عورت کو دوسری میز پہ بیٹھی شراب پیتے دیکھا۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ اس سے پہلے اس نے کسی ہندستانی عورت کو شراب پیتے نہیں دیکھا تھا۔

بہت دیر تک سارے لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ ذاتی اور کچھ کاروباری بھی۔ منیش نہ چاہنے کے باوجود سب سے باتیں کرتا رہا۔ گرچہ اُسے کوئی چیز پسند نہیں آئی۔ دو بجنے کے بعد وہ کھانا کھا کر کلب سے نکلا تو اس کی طبیعت بدمزا سی تھی۔ اسے کلب کی ایک بات بھی پسند نہیں آئی۔ اس نے ساہا سے کہا۔

"مجھے یہ زندگی پسند نہیں۔ کلب کا ممبر بن جاتا ہوں۔ لیکن کلب کی زندگی سے مجھے دل چسپی نہیں۔ لائبریری سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ یہ زندگی کچھ اچھی نہیں۔"

امل داس جب تک کلب میں رہا، اپنے بھائی کے پاس لائبریری میں رہا۔ وہ کمپنی کا افسر نہیں تھا اس لئے نہ کلب کا ممبر بن سکتا تھا اور نہ وہاں کی پارٹیوں میں حصہ لے سکتا تھا۔ اربند ساہا کی گنتی افسروں میں تھی۔ اس لئے ممبر تھا۔ تارک ناتھ بسو اس نے اسے بھی ممبر بنوایا تھا۔

منیش اربند ساہا اور امل داس کے ساتھ دارجلنگ کی سیر کرتا رہا۔ مسٹر اور مسز گپتا سے ملا۔ اور شام کے وقت کرسیانگ واپس آیا۔ اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا۔ ہر چیز بے ترتیب پڑی تھی۔ لال بہادر آیا۔ تو اس نے بتایا کہ کانچی کو بخار آگیا ہے۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ چپ رہا جیسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کپڑے بدلے۔ کھانا کھایا۔ اور ایک کتاب لے کر بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے دن سویرے لال بہادر چائے لے کر آیا۔ تو اس نے بتایا کہ رات کے وقت

کانچی کو بخار تیز تھا۔ اور وہ نیند میں بڑبڑاتی رہی تھی۔ اُس نے کہا کہ ناشتہ دے کر وہ ڈاکٹر کے یہاں جائے گا تو منیش نے کہا۔

"ڈاکٹر کو بلا کر اُسے دکھا دو۔ اور دوا لا دو۔"

اور بٹوے سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر دیئے۔ لال بہادر بولا۔

"پیسہ ہے صاحب"

منیش نے اسے دیکھا اور روپے ہاتھ میں دے کر بولا۔

"جاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا کر اسے دکھاؤ۔ اور دوا لا کر دو۔ اور دیکھو اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ضرورت پڑے تو اور روپے مانگ لینا"

لال بہادر نے روپے لے لئے اور بولا۔

"بہت ٹھنڈا پڑا صاحب۔ بہت آدمی بیمار ہو گیا۔ کانچی کو بھی ٹھنڈا لگا۔ اس کا کوٹ پھٹ گیا ہے۔ دو دن بڑا ٹھنڈا پڑا۔ اوکھالی پرانا سوئیٹر پہنے پھرتا رہا۔ اب واٹسن صاحب اور اس کا میم تو نہیں کہ نیا کوٹ بنا کر دے۔ ہم کو بھی ٹھنڈا لگا صاحب۔ مگر بخار نہیں آیا۔"

منیش کو یاد آیا کہ کانچی دونوں دن سوئیٹر پہنے اور ہلکی سی چادر اوڑھے کام کرتی رہی تھی۔ اُس نے لال بہادر سے کہا۔

"جاؤ۔ اس کو دکھا کر دوا لا کر دو۔ تم بھی ڈاکٹر کو دکھا کر اپنے لئے دوا لے لینا"

لال بہادر چلا گیا۔ وہ سوچتا رہا۔ غریبوں کی زندگی بھی کیا ہے۔ یہ پہاڑی لوگ تو اسی آب و ہوا میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ باہر والوں کے لئے تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ کانچی کے پاس کوٹ نہیں تھا اور وہ معمولی کپڑے پہنے کام کرتی رہی۔ یہ زیادتی ہے۔

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہی مجرم ہے۔ اگر اس کے کاموں میں دوڑی نہ پھرتی تو بیمار نہیں ہوتی۔ اُسے اس کا بھی دُکھ ہوا کہ اُس نے لال بہادر سے ایک بات کہی اور وہ کانچی کو بری لگی۔ اُسے ذرا اطمینان ہوا کہ لال بہادر کو اس نے روپے دے دیئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کو دکھا کر کانچی کا علاج کرائے گا۔ اس کا جی تو چاہا کہ خود لال بہادر کے گھر جائے۔ اور کانچی کو دیکھ کر آئے۔ لیکن وہاں جانا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

منیش کو کرسیانگ میں اپنے آفس اور گھر کے علاوہ اور کسی آدمی یا جگہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی کرسیانگ میں مسٹر لوبسکن کے علاوہ کسی سے زیادہ جان پہچان نہیں تھی۔ مسٹر لوبسکن ہی اس سے ملنے کے لئے دو تین بار آیا تھا۔ منیش اس کی سیدھی سادی زندگی اور غریبوں کی خدمت کرنے کے جذبے سے متاثر تھا۔ مسٹر لوبسکن انگریز تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں فوج میں افسر تھا لیکن لڑائی ختم ہوتے ہی اس نے فوجی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اور ایک چائے بگان میں منیجر مقرر ہو کر دارجلنگ آگیا تھا۔ مگر یہ نوکری بھی اس نے چھوڑ دی تھی۔ ایک پہاڑی لڑکی سے اس نے بیاہ کر لیا تھا۔ چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ دن بھر غریب پہاڑیوں کی بھلائی کے کام کرتا رہتا تھا۔ اس نے دس بارہ چھوٹے چھوٹے اسکول بنا رکھے تھے، ان میں بچوں کو پڑھانے کا انتظام تھا۔ دو ہسپتال بنا رکھے تھے، جن میں غریبوں کو ہومیوپیتھک دوائیں مفت میں ملتی تھیں۔ عورتوں کے لئے دست کاری کا اسکول تھا، جس میں ان کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ان سے کام لیا جاتا اور انھیں واجب مزدوری دی جاتی تھی۔ مسٹر لوبسکن ان ساری چیزوں کو بیچنے کا انتظام کرتا تھا۔ اس طرح بہت سی غریب عورتیں اس کی مدد سے زندگی گزار رہی تھیں۔ اور ان کے بچے تعلیم پا رہے تھے۔ مسٹر لوبسکن سے وہ پہلی ہی ملاقات کے بعد قربت محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اس کے گھر گیا تھا۔ اس کی پہاڑن بیوی سے ملا تھا۔ وہ بھی

بہت نیک اور محنتی عورت تھی۔ اور ایک اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ اس نے مسٹر بوسکن کے بارے میں خود اس کی زبان سے بہت سی باتیں سنی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ یورپ میں اس کے بہت سے دوست ہیں جو ہر ماہ اسے روپے بھیجتے ہیں۔ اور وہ اس علاقے کی چیزیں خاص کر چائے یورپ بھیجتا ہے اور اس سے روپے کما لیتا ہے۔ اس طرح اس کے اسکول اور ہسپتال کا خرچ نکل آتا تھا۔ لیکن مسٹر بوسکن کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کب کہاں رہتا ہے۔ اور کس جگہ میں رہتا ہے۔ دارجلنگ علاقہ کے سارے لوگ اس کو جانتے تھے۔ اس کو "اپنا صاحب" کہتے تھے۔ اور جس غریب آدمی کو کوئی ضرورت پیش آتی تو بے دھڑک اس کے پاس پہنچ جاتا اور مدد مانگتا۔ مسٹر بوسکن سے جو بھی ممکن ہوتا اس کی مدد ضرور کرتا۔ بوسکن اپنی سائیکل لے کر دور دور گاؤں میں نکل جاتا تھا۔ کبھی اسے سائیکل کہیں چھوڑ کر پیدل بھی جانا پڑتا تھا۔ منیش اس سے ملنا چاہتا تھا۔ بوسکن اپنے تجربے اسے بتایا کرتا تھا۔ بہت سے پرانے قصے سنایا کرتا تھا۔ جو دلچسپ بھی ہوتے تھے۔ اور ان سے اس علاقے کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ جب بھی وہ آفس سے واپس آتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ مسٹر بوسکن آ جائے۔ لیکن مسٹر بوسکن کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ہر روز آ کر اس سے ملا کرے۔

منیش آفس سے واپس آ کر سائبان یا صحن میں بیٹھ کر چائے پیتا اور کوئی کتاب لے کر پڑھنے لگتا۔ اور جب پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی تو کتاب الگ رکھ کر کن چن جنگا کی چوٹی کو دیکھا کرتا۔ اس میں بڑی دلچسپی محسوس کرتا۔ ہر لمحہ چوٹی پر بدلا ہوا رنگ اور نیا منظر نظر آتا۔ اور وہ بھول جاتا کہ کہاں ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہاں جا کر دیکھے کہ کیا ہے۔ بچپن میں اس نے بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ پہاڑوں کی اونچی برفیلی چوٹیوں پر دیو لوک ہے۔ وہاں دیوتا رہتے ہیں، دیویاں رہتی ہیں اور کوئی آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن کبھی کبھی وہ بڑی تنہائی محسوس کرتا۔ اور اس کا

دل چاہتا کہ کوئی دوست ہوتا جس کے ساتھ باتیں کر کے وقت کاٹ سکتا۔ لیکن کرسیانگ میں اس سے ملنے والے صرف چند آدمی تھے۔ اور وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ ملاقات تو کچھ اور لوگوں سے ہو گئی تھی۔ چائے بگانوں کے منیجروں اور اسسٹنٹ منیجروں سے۔ اُن میں سے کچھ لوگوں نے اُسے دعوت بھی دی تھی۔ لیکن ان کی زندگی سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کلکتہ میں اس نے چائے بگانوں کے منیجروں کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ دن بھر آفس میں کام کرنے کے بعد ان لوگوں کو اپنے گھر میں یا کلب میں بیٹھ کر شراب پینے اور آوارگی کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ اور اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب وہ سائبان یا صحن میں بیٹھ کر کن چن جنگا کی چوٹی کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتا تو کمرے میں آکر لیٹ جاتا۔ ایسے وقت میں کانچی آجاتی تو اس سے باتیں کرنے میں اس کا دل بہل جاتا۔ کانچی سمجھ دار لڑکی تھی۔ جس بات کو جانتی تھی اس کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے دیتی تھی، جن باتوں کو نہیں جانتی تھی ان کے بارے میں دو ٹوک کہہ دیتی کہ وہ نہیں جانتی۔ کبھی بات بنا کر بنانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اور جو باتیں معلوم ہوتیں اُن کے بارے میں مسکرا مسکرا کر جو کچھ اسے معلوم ہوتا بتاتی جاتی تھی۔ اس سے باتیں کرنے میں منیش ایسا لطف محسوس کرتا جیسے بھولے بچے سے باتیں کرنے میں کوئی محسوس کرے۔

کانچی دو دن میں اچھی ہو گئی۔ لیکن آئی نہیں۔ منیش کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے نہ آنے سے بڑی کمی رہ گئی ہے۔ اس کی ساری چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کانچی نے اس کی کون چیز اٹھا کر کہاں رکھ دی ہے۔ اور اگر اسے کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو کہاں تلاش کرے گا۔

شام کے وقت منیش آفس سے واپس آیا۔ کام زیادہ تھا اور وہ خطوں کے جواب لکھوانے

میں تھک گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تھکاوٹ اس لئے تھی کہ مسٹر مارٹن اس کے آفس میں آگیا تھا۔ کاروباری باتیں ختم کرنے کے بعد دیر تک فضول باتیں کرتا رہا تھا، جس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی طبیعت اکتا گئی تھی۔ گھر آکر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ صحن میں بیٹھ کر چائے پی۔ اور ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن اُس کی طبیعت نہیں لگی۔ اس نے کتاب میز پر ڈال دی اور کن چن جنگا کی چوٹی کو دیکھنے لگا۔ چوٹی کا رنگ ہر پل بدلتا جا رہا تھا اور نیچے وادی جیسے گہرے دھوئیں کی تہہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس میں بھی اس کی طبیعت نہیں لگی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہے۔ جیسے سزا کے دن کاٹ رہا ہے۔ پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ اس کی شادی ہو چکی ہوتی تو اس کی زندگی زیادہ دلچسپ اور پر لطف ہوتی۔ کتابیں بڑی حد تک تنہائی کی ساتھی بن سکتی ہیں۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ آنکھیں کچھ اور بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔ کان کچھ سننا چاہتے ہیں۔ اور دل بھی کچھ چاہتا ہے۔ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اور ٹہلتا ہوا باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ لال بہادر کھکھری سے لکڑی کاٹ رہا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اور واپس ہونے کو مڑا تو یکایک رُک کر لال بہادر سے بولا۔

"لال بہادر۔ کانچی سے کہہ دو۔ میرا کمرہ درست کر دے۔ ساری چیزیں اُلٹی پلٹی پڑی ہیں۔"

لال بہادر بولا۔

"اچھا صاحب۔"

منیش پھر بڑے صحن میں آگیا۔ اُس کی طبیعت اُچاٹ ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر صحن میں ٹہلتا رہا۔ پھر مکان کے احاطے سے نیچے دوسرے صحن میں چلا گیا۔ ہری گھاس پر ٹہلتا رہا۔ وہاں ٹہلتے ہوئے اس نے عجیب سا سکون محسوس کیا۔ وہاں سبزہ، پھول اور پودے زیادہ خوبصورت اور تازہ

نظر آئے۔ دیر تک وہاں ٹہلتا رہا۔ شام ہو گئی اور فضا میں خنکی پیدا ہو گئی تو وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ذرا دیر میں کانچی آگئی۔ اور آہستہ سے بولی۔

"تم نے مجھے بلایا ہے؟"

منیش نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں میں نے بلایا ہے۔"

کانچی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

منیش آہستہ سے بولا۔

"دیکھو میرے کمرے کا کیا حال ہے؟"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"میں تو جانتی تھی کہ کیا حال ہو جائے گا۔ تم کو میرا آنا پسند نہیں تھا اس لئے نہیں آئی۔"

آواز منیش کے حلق میں جیسے پھنس گئی۔ وہ کوشش کر کے بولا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"اچھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اسی وقت باہر کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ مسٹر مارٹن سائبان میں کھڑا تھا۔ اس وقت مسٹر مارٹن کا آنا منیش کو پسند نہ آیا۔ لیکن اس کی طرف کرسی بڑھائی۔ اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ پھر یکایک اٹھا اور کمرے میں جا کر کانچی سے بولا۔

"جلدی سے چائے بھجواؤ"۔

اور باہر آگیا۔ مارٹن نے پوچھا۔

"تمہاری بیوی بھی ساتھ ہے؟"

منیش نے جواب دیا۔

"میرا تو بیاہ ابھی نہیں ہوا ہے"۔

مارٹن بولا۔

"عورت کی آواز تھی ـــــ کوئی دوست ـــــ لڑکی؟"

منیش گھبرا گیا۔ جس سے وہ ڈرتا تھا وہ بات سامنے تھی۔ نہ جانے مارٹن کیا سمجھے۔ اور دوسروں سے کیا کہے۔ مارٹن کی عادت تھی۔ ایک آدمی کی بات دوسروں کے یہاں دہرایا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"نہیں۔ میری کوئی دوست لڑکی نہیں۔ باورچی کی بیٹی ہے"۔

مارٹن زور سے ہنسا اور بولا۔

"تم میرے سامنے بچے ہو۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو"۔

منیش کو مارٹن کی بات بری لگی۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ مارٹن بولا۔

"لڑکیوں سے دوستی کرنا بری بات نہیں۔ تم نوجوان ہو، تمہارا بیاہ بھی نہیں ہوا ہے۔ تمہیں لڑکیوں سے دوستی کرنے کا حق ہے۔ میں تو آج بھی کئی لڑکیوں سے دوستی رکھتا ہوں"۔

مارٹن بھدے انداز میں ہنسا۔ اگر مارٹن اس کے گھر پر نہ ہوتا تو شاید اُسے سخت جواب دیتا۔ اس کی بات اسے بہت بری معلوم ہوئی تھی۔ وہ چُپ رہا۔ مارٹن نے کہا۔

"ہندستان میں محبت پر بھی روک ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ ہر آدمی کو محبت کرنے کا حق ملنا چاہیئے۔ محبت کرنا کوئی بری بات نہیں۔ بھوک لگتی ہے تو آدمی روٹی کھاتا ہے۔ دل کی بھوک محبت ہے۔ دل کی غذا یہی ہے۔ وہ کسی سے محبت کرے اور اس سے کوئی محبت کرے۔"

مارٹن نے پی رکھی تھی اور بولنے میں بہک رہا تھا منیش نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بیاہ ہو جائے گا تو بیوی سے محبت کروں گا۔ دوسری عورت سے نہیں۔"

مارٹن زور سے ہنسا۔

"پہلے بیاہ پھر محبت۔ محبت پہلے۔ بیاہ بعد میں ہونا چاہیئے۔"

منیش نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"مسٹر مارٹن ہر قوم کی اپنی اپنی ریت ہوتی ہے۔"

لال بہادر چائے لے کر آگیا تو مارٹن بولا۔

"ارے تم چائے پلواتے ہو۔ میں تو تم کو دعوت دینے آیا تھا۔ دارجلنگ چلو۔ آج کلب میں ڈانس کا اچھا پروگرام ہے۔"

منیش نے چائے پیالی میں انڈیلی اور پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مسٹر مارٹن مجھے کلب کے ڈانس پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میرا وقت کتابوں میں اچھا کٹ جاتا ہے۔"

مارٹن جیسے غصے میں بولا۔

"لعنت بھیجو کتابوں پر۔ یہ تو آدمی کو کھٹارا بنا دیتی ہے۔ مجھے تو کتابوں سے نفرت ہے۔"

اور کھڑا ہو گیا۔ چائے کی پیالی اٹھائی اور جلدی جلدی پی گیا۔ پھر بولا۔

"میں تو دار جلنگ جا رہا ہوں۔ تم نہیں جاؤ گے۔ ٹاٹا۔"

وہ چلا گیا۔ منیش اسے دروازے تک چھوڑ آیا۔ پھر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ کانچی شلف میں کتابیں رکھ رہی تھی۔ منیش کو دیکھتے ہی بولی۔

"یہ کون تھا۔ گندا آدمی۔ اس سے کیوں ملتے ہو۔ بہت ملا کرو ایسے گندے آدمیوں سے۔"

منیش کانچی کا منہ تکنے لگا۔ اسے کانچی کی بات اچھی نہیں لگی۔ اب وہ یہ چاہتی ہے کہ کس سے ملے اور کس سے نہ ملے۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ کانچی خود ہی بولی۔

"کھانا سویرے کھالو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

منیش نے بات بدل دی۔ اور بولا۔

"تم نے کپڑے ٹھیک سے نہیں پہنے اور کمرے میں دوڑتی رہیں۔ بیمار ہو گئیں۔ اپنا خیال رکھو۔"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"میرا کوٹ پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ اب اتنے پیسے کہاں ہیں جو بنواؤں۔"

منیش کی زبان سے ارادہ کے بغیر نکل گیا۔

"تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔؟"

"تم سے کیوں کہتی؟"

کانچی نے جواب دیا۔ منیش بولا۔

"میں تمھیں کوٹ بنوا دیتا۔"

کانچی نے منیش کو عجیب نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"تم کیوں بنوا دیتے۔؟"

منیش اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"تم میرا اتنا کام کر دیتی ہو۔"

کانچی کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ اور بولی۔

"اور میرا کام کرنا تم کو ناگوار ہوتا ہے۔"

منیش نے محسوس کیا جیسے وہ طنز کر رہی ہے۔ اور بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"اچھا۔ کھانا سویرے کھالو۔ اور سو جاؤ۔ ٹھنڈک بڑھ رہی ہے۔ کل آ کر سارے کام کر دوں گی۔"

منیش آہستہ سے بولا۔

"منگالو۔"

کانچی جلدی سے باورچی خانے میں جا کر باپ سے کھانا لانے کو کہہ آئی۔ اور خود کام کرتی رہی۔ تھوڑی دیر میں لال بہادر کھانا لے کر آگیا۔ منیش کھانے پر بیٹھا۔ تو اس نے دیکھا۔ لال بہادر ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے لال بہادر سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کوٹ نہیں ہے کیا؟"

"نہیں صاحب۔ واٹسن صاحب دیا تھا پھٹ گیا۔"

منیش چپ چاپ کھانا کھاتا اور سوچتا رہا۔ ان پہاڑیوں کی زندگی کتنی عجیب ہے۔ ان کی ساری دولت پر دوسروں کا قبضہ ہے۔ کروڑوں روپے کی چائے ساری دنیا میں بھیجی جاتی ہے۔

لیکن ان بے چاروں کی قسمت میں مزدوری اور باہر سے آکر دولت کمیٹنے والوں کی خدمت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کا علاج اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا منیش کھانا کھانے کے بعد بستر میں گھس گیا۔ سردی تھی۔ لیکن بہت زیادہ نہیں تھی۔ لال بہادر نے پوچھا۔

"اور کوئی کام صاحب؟"

منیش بولا۔

"لال بہادر کل اتوار ہے۔ میں ناشتہ کر کے دارجلنگ چلا جاؤں گا"

لال بہادر کچھ بھی نہیں بولا۔ کواڑ کھینچتا ہوا چلا گیا۔ منیش دیر تک بستر میں گھسا پڑھتا رہا۔ پھر اس نے کتاب رکھ دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا تو بہت سی باتیں اس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔ خاص کر کانچی کی۔ کانچی اتنے شوق سے اس کا کام کیوں کرتی ہے۔ پیسے لینا بھی نہیں چاہتی۔ دوسرے لوگ تو ایسے نہیں۔ پہاڑی لوگ سیدھے سادے ضرور ہیں۔ لیکن سب لال بہادر اور کانچی جیسے نہیں ہیں۔ کلکتہ میں تو لوگ کام کئے بغیر ہی پیسے وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ لال بہادر کو جب پیسے دیتا ہے تو وہ لے لیتا ہے۔ لیکن یہ کانچی۔ ! اُسے خیال آیا۔ دوسرا دن اتوار کا تھا۔ مارٹن کلب میں اتوار گزارنے جا رہا تھا۔ اس نے بھی دارجلنگ جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن کلب کی لائبریری سے کتابیں لانے اور بازار سے کپڑا خریدنے کے لئے۔ اُسے یقین تھا کہ لال بہادر کو جب وہ کپڑے دے گا تو وہ شکریہ ادا کرے گا۔ لیکن کانچی —؟ اس کا اعتبار نہیں تھا۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو —؟ اس کے سامنے نیا سوال اُٹھ کھڑا ہوا — سوچتے سوچتے اُسے نیند آگئی۔

صبح سویرے کانچی چائے لائی۔ اور پیالی اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"آج سارا کمرہ ٹھیک کر دوں گی۔"

منیش بولا۔

"پھر تم اتنا سویرے آ گئیں۔ نومبر کا مہینہ ہے۔ ٹھنڈک روز بڑھتی جا رہی ہے۔

اپنی صحت کا خیال رکھو۔"

کانچی نے فوراً جواب دیا۔

"میری فکر مت کرو۔ میں اسی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور بڑھی ہوں۔ اس کی عادی ہوں۔

اپنی صحت کا خیال رکھتی ہوں، تم اپنا خیال ضرور رکھو۔"

منیش نے کہا۔

"آج اتوار کا دن ہے۔ چھٹی ہے۔ میں ناشتہ کر کے دارجلنگ چلا جاؤں گا۔ وہاں

کام ہے۔ اور شام تک واپس آؤں گا۔"

کانچی نے اس انداز میں جواب دیا، جیسے کوئی بزرگ چھوٹے بچے کو سمجھائے۔

"دارجلنگ جاؤ۔ مگر کلب میں گندے لوگوں سے نہ ملنا۔ اُن کی گندی عادتیں نہ سیکھنا۔

واٹسن صاحب کبھی کلب نہیں جاتا تھا۔ شراب بھی اپنے گھر پر پیتا تھا۔"

منیش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے دے کر کانچی دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ دو

تین دنوں میں منیش کی ساری چیزیں الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی تھیں۔ منیش چائے پیتا اور سوچتا رہا۔

یہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ خوب اور بے جھجک باتیں کرتی ہے۔ اور کبھی ایک لفظ ایسا نہیں بولتی جس سے

کسی طرح کا بھی لالچ ظاہر ہو۔ لیکن سارے کام خوشی کے ساتھ کرتی جاتی ہے۔ کیا یہ بھی مسز ٹوبکن

جیسی ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنے میں اُسے مزا آتا ہے۔ اس نے سوچا کوٹ تو اس کے لئے

سلوانا ہے۔ لیکن کیسا۔؟

منیش کو خود اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ وہ وقت سے پہلے ہی سوچ رہا تھا۔ ابھی کپڑے کا پتہ بھی نہیں تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کانچی کوٹ کیسا سلوائے گی۔ اس کا جی چاہا کہ کانچی سے پوچھے۔ اُسے کون سا رنگ پسند ہے۔ مگر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ڈر گیا کہ کہیں اس نے انکار کر دیا تو پھر اُسے سمجھانا ناممکن ہو جائے گا۔ اُس نے پکارا۔

"کانچی۔۔۔!"

"کیا ہے؟"

کانچی دوسرے کمرے سے آ گئی۔ اور سامنے کھڑی ہو گئی۔ منیش نے پوچھا۔

"تم سویرے سویرے آ جاتی ہو۔ تم کو ٹھنڈک معلوم نہیں ہوتی۔"

کانچی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور مسکرا کر بولی۔

"تم کو میری فکر بہت زیادہ ہے۔"

منیش نے جواب دیا۔

"تم میرا اتنا کام کر دیتی ہو۔ ایک بار بیمار ہو گئیں۔"

کانچی نے منیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم کو میرا اتنا خیال ہے تو میرا آنا تمہیں جبر کیوں ہوا تھا؟"

منیش اس سوال سے بوکھلا سا گیا۔ لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور بولا۔

"تم نے مارٹن کی بات سنی تھی نا۔"

کانچی کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بولی۔

"وہ بدمعاش آدمی ہے۔ اپنے جیسا دوسروں کو بھی سمجھتا ہے۔"

منیش نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن کوئی دوسرا آدمی بھی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کو کوئی کچھ کہے۔"

کانچی دیوار سے لگی کھڑی رہی، لیکن تن سی گئی اور بولی۔

"تم بہت سیدھے آدمی ہو۔ بُوا بھی کہتا ہے، صاحب سادھو ہے۔ اور میں بھی سمجھتی ہوں۔ اور اسی لئے آتی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہوتی تو بُوا تمھارا کام کرنے کو نہیں کہتا۔ اور نہ آنے دیتا۔ مجھے بہت سی نوکریاں ملیں۔ مگر نہ میں نے کی اور نہ اس نے کرنے دیا۔ وہ دن بھر یہاں رہتا ہے۔ وہ نہیں ہوتا تو کیوں آتی؟"

منیش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے بحث کرنا فضول تھا۔ وہ کسی بات کا ایک رُخ ہی دیکھتی تھی۔ اور سیدھی بات سوچتی تھی۔ اور فوراً جواب دے دیتی تھی۔ وہ چائے پیتا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔ کانچی بولی۔

"میں نہیں ڈرتی کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ میں بچہ اور بے عقل نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ تم میری فکر مت کرو۔"

منیش مسکراتا ہوا بولا۔

"تم بہادر لڑکی ہو۔"

کانچی اسی طرح بولتی رہی۔

"بُوا (باپ) بہت نیک آدمی ہے۔ مگر اتنا ہی سخت آدمی بھی ہے۔ اگر مجھے غلط راستے

پر چلتا دیکھے گا تو کاٹ کر کھڈ میں ڈال دے گا۔"

منیش نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔

"اچھا چائے دو اور ناشتے کا انتظام کرو۔ میں جلدی جانا اور آجانا چاہتا ہوں۔"

کانچی مسکرائی اور چائے دان اٹھا کر اس کی پیالی میں چائے انڈیلتی ہوئی بولی۔

"تم بالکل بے فکر رہو۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گی، جو کوئی تمہاری طرف انگلی اٹھا سکے۔"

اور پیالی اٹھا کر منیش کے ہاتھ میں تھما دی۔ منیش نے اسے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ

کانچی آئینے کی طرح صاف ہے۔ اور یہ اس کے دل کا کھوٹ ہے جو اسے ڈرا رہا ہے۔ پھر بھی

وہ مسکرایا اور بولا۔

"کانچی۔ دنیا والے تمہاری اور میری طرح صاف دل کے نہیں ہیں۔ اپنی برائیاں

دوسروں میں دیکھتے ہیں۔"

کانچی ہنسنے لگی۔ منیش گھبرایا۔ وہ بولی۔

"ڈرتے ہو۔ ڈرو گے تو لوگ اور ڈرائیں گے۔ اور تم ان کی زبان پکڑ نہیں سکتے۔"

منیش نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اور بولا۔

"تم نے یہ ساری باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

کانچی بولی۔

"واٹسن میم صاحب ہمیشہ سمجھاتی تھی۔ سچائی پر رہو۔ اچھے کام کرو۔ اور دنیا والوں کی

پرواہ مت کرو۔"

منیش سوچنے لگا یہ مسز واٹسن کی تعلیم ہے۔ یہ لڑکی ہندستانیوں کی طرح نہیں سوچتی۔

نہ ڈرتی ہے اور ہندستانی لڑکیوں کی طرح کسی بات کا رونا روتی ہے۔ مسز واٹسن ٹھیک ہی کہتی تھی۔ عورتوں کو اتنا دلیر تو ہونا ہی چاہیئے۔ دنیا والوں کی بکواس سے ڈرنے والے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے چائے ختم کی۔ پیالی میز پر رکھ دی اور غسل خانے میں گھس گیا۔ جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ کانچی اس کی کتابوں کو شلف میں رکھ رہی ہے۔ لیکن اسے دیکھتے ہی اس نے کتابوں کو چھوڑ دیا۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر ایک قمیض لے آئی۔ اور کرسی پر اسے رکھتی ہوئی بولی۔

"تمہاری قمیضوں کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔ آج بازار سے خرید کر لے آؤں گی۔ تم کسی چیز کا بھی خیال نہیں رکھتے۔"

وہ مسکرائی۔ منیش نے کہا۔

"مجھے خیال رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ تم ہر بات کا خیال رکھتی ہو اور میرے سارے کام کر دیتی ہو۔"

کانچی کے موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔ وہ بولی۔

"مجھے تمہارا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

منیش دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ اور جب کپڑے پہننے کے بعد ناشتہ کرنے بیٹھا تو کانچی بولی۔

دارجلنگ ضرور جاؤ۔ اتوار کا دن ہے اور موسم بھی اچھا ہے۔ سیر کر آؤ۔ لیکن کلب والوں کے چکر میں نہ آنا۔ مسٹر واٹسن صرف کرسمس میں کلب جاتا تھا۔ کہ سارے لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔ اور واپس۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ گندگی پھیلانے کے لئے کلب جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھر پر شراب پیتا تھا۔ مسز واٹسن خود اپنے ہاتھ پگ بنا کر دیتی تھی۔ اور دو پگ کے بعد شراب الماری میں

بند کر دیا کرتی تھی۔ مسٹر واٹسن کو کبھی نشہ نہیں آیا۔ تم جاؤ۔ مگر شراب نہ پینا۔ گندے لوگوں کی صحبت میں نہ رہنا۔"

منیش مسکرایا۔ اور بولا۔

"تم کو میرا کتنا خیال ہے۔ مت گھبراؤ۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

منیش چلا گیا۔ کانچی اس کا سامان درست کرنے لگ گئی۔

منیش شام سے پہلے ہی دارجلنگ سے لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ بہت سا سامان تھا۔ جو قلی نے لایا۔ کار بنگلے تک آ نہیں سکتی تھی۔ راستہ نہیں تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بہت سے ایسے مکان تھے جہاں تک کوئی سواری نہیں جا سکتی تھی۔ بڑے لوگوں کے مکان تھے، جن کی کاریں دور رہتی تھیں۔ اور ضرورت کے وقت سڑک تک آ جاتی تھیں۔ منیش کو بھی اس کی کمپنی کی کار سڑک تک پہنچا کر چلی گئی تھی۔ قلی نے ساری چیزیں سائبان میں رکھ دیں اور پیسے لے کر چلا گیا۔ لال بہادر نے سارا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھ دیا۔ منیش نے کہا۔

"آج تھک گیا ہوں۔ چائے پلاؤ۔"

لال بہادر چائے بنانے چلا گیا۔ کانچی آ گئی۔ جیسے وہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں آتے ہی بولی۔

"اتنا سارا سامان کیا لے آئے ہو۔"

وہ مسکرایا اور بولا۔

"کھول کر دیکھ لو۔"

منیش نے مسکرا کر کہا۔ اور کانچی نے ہر پیکیٹ کو کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ ہر پیکیٹ کو کھول کر بچوں کی طرح خوش ہوتی رہی۔ بہت سے کپڑے تھے۔ وہ گھبرائی ہوئی خوشی کے ساتھ بولی۔

"اتنے کپڑے ۔۔!"

لال بہادر چائے لے کر آگیا۔ اس نے ٹرے چھوٹی میز پر رکھ دی۔ اور کپڑوں کو دیکھنے لگا۔ کانچی چائے بنانے لگی۔ منیش نے کوٹ کا اونی کپڑا اٹھا کر لال بہادر کو دیا۔ اور بولا۔

"لال بہادر یہ تمہارے لئے لایا ہوں۔ پسند آیا؟"

لال بہادر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ بولا۔

"بہت اچھا اور دامی ہے صاحب۔ آپ مہاتما ہے۔ دوسرا ادمی صاحب"۔

منیش نے دو گرم کوٹ دو پتلون اور قمیص کے کپڑے الگ رکھے۔ اور بولا۔

"ایک مالی اور ایک چوکیدار کے لئے۔"

لال بہادر خوش ہو کر کپڑے سمیٹے کمرے سے باہر چلا گیا۔ منیش نے ایک خوبصورت کپڑا اٹھایا اور کانچی سے پوچھا۔

"کیسا ہے؟"

"بہت خوبصورت ہے۔ مگر یہ تو عورت کے لئے ہے۔"

کانچی بولی۔ منیش نے مسکرا کر کہا۔

"تمہارے لئے مردوں کا کپڑا تو نہیں لاتا۔"

کانچی کا چہرہ جیسے مرجھا گیا اور وہ بولی۔

"مگر میں نے تو تم کو کپڑا لانے کو نہیں کہا تھا۔"

منیش مسکرایا اور بولا۔

"اپنی پسند سے بھی تو کوئی کام کر سکتا ہوں۔"

کانچی رو ہانسی ہو گئی۔ مجھے بدلا دینا چاہتے ہو۔ اور میری خوشی کو چھین لینا چاہتے ہو۔ جو مجھے تمھارا کام کر کے ہوتی ہے۔ یا غریب سمجھ کر میری مدد کرنا چاہتے ہو"

منیش کے دل پر کانچی کی بات گولی کی طرح لگی۔ وہ تلملا گیا۔ اس نے کانچی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اُسے افسوس ہوا کپڑے وہ کیوں لایا۔ اسے یقین تھا کہ کانچی کپڑے لے کر خوش ہو گی۔ اپنے گھر میں اس نے یہی دیکھا تھا۔ جب بھی اپنی بہن کے لئے کوئی چیز لاتا تھا تو وہ خوش ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ کانچی عجیب لڑکی تھی۔ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کون سی بات اُسے پسند آئے گی اور کون سی ناپسند ہو گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا کہے۔ گھبرا کر اس نے کہا۔

"کانچی۔ یہ کپڑے میں بڑے شوق سے تمھارے لئے لایا ہوں۔ اگر تم نہیں لوگی تو مجھے بہت دُکھ ہو گا۔"

کانچی منیش کا مُنہ تکنے لگی۔ وہ بولا۔

"دیکھو یہ تمھارے کوٹ کے لئے ہے۔ یہ بلاؤز اور یہ ساڑیاں۔ اٹھاؤ۔"

کانچی نے سارے کپڑے اس طرح اٹھائے جیسے اس سے زبردستی اٹھوائے گئے ہوں ـــ اتنے میں لال بہادر آ گیا۔ تو وہ بدل سی گئی اور مسکرا کر بولی۔

"بُوا ـــ صاحب میرے واسطے لایا ہے۔"

"لے جا۔ صاحب بڑا دیالو ہے ـــ"

کانچی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ منیش بولا۔

"لال بہادر کل سارے کپڑے درزی کو دے آنا۔ جاڑا آرہا ہے اور تم سب کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔"

لال بہادر بولا۔

"اچھا صاحب۔ کل سب کپڑا سینے کو دے آئے گا۔ اور صاحب ہم کھانا پکا کر چلا جائے گا۔ کانچی آپ کو کھانا کھلا دے گا۔ اور صاحب کل ہم ذرا دیر سے آئے گا۔ صبح کا چائے کانچی دے گا۔"

"اچھا۔"

منیش نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"سارے کپڑے لاکر یہاں رکھ دو۔ باورچی خانہ میں گندے ہو جائیں گے۔"

کانچی اپنے کپڑے رکھ کر لال بہادر کے کپڑے لانے چلی گئی۔ لال بہادر بولا۔

"صاحب۔ ایک لڑکا دیکھا ہے کانچی کے واسطے۔ کلکتہ میں کام کرتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ تین سو روپیہ مہینہ کماتا ہے۔ ہم چاہتا ہے کہ کانچی کا بیاہ جلد ہو جائے تو میرا بوجھ اتر جائے۔"

منیش بولا۔

"اچھا ہے۔ اس کا بیاہ ہو جائے تو تمھارا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

لال بہادر بولا۔

"ہم کیا کرے گا صاحب۔ پہلے بھی بات آگیا۔ ای نا بول دی۔ لڑکا پڑھا لکھا نہیں تھا۔ ای پڑھا لکھا ہے۔"

منیش بولا۔

"جاؤ۔ بات پکی کر لو۔"

لال بہادر چلا گیا۔ منیش کو سچ مچ خوشی ہوئی۔ کانچی کا بیاہ ہونے والا تھا۔ اس نے سوچا کہ جس آدمی کا کانچی سے بیاہ ہوگا وہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔ اسے گھر کی کوئی فکر نہیں رہے گی۔ یکایک جیسے وہ چونک اٹھا۔ کانچی کا بیاہ ہو جائے گا۔ اور وہ چلی جائے گی تو اس کی چیزوں کو کون سنبھال کر رکھے گا۔ دو دن وہ نہیں آئی تھی تو گھر کباڑ خانہ بن گیا تھا۔ لیکن کانچی اس کا گھر کب تک دیکھے گی۔ خود اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر سے خط آنے کا انتظار تھا۔ کانچی چلی جائے گی تو کچھ دنوں تک تکلیف ضرور ہوگی۔ پھر کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔

کھانا کھلاتے وقت کانچی بولی۔

"تم میرے لئے اتنے کپڑے کیوں لائے؟"

منیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا جی چاہا۔"

کانچی گمبھیر انداز میں بولی۔

"تم ڈرتے ہو، دوسرے لوگ کیا کہیں گے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ تم نے اتنے کپڑے مجھے لا کر دئے ہیں۔ تو وہ شک کر سکتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے۔ کانچی کو اتنے کپڑے کیوں دئے۔ دنیا والوں کے منہ بند نہیں کئے جا سکتے۔"

منیش کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ کانچی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ دوسرا تو دوسرا لال بہادر کو بھی شک ہو سکتا ہے۔ اتنا مہربان کیوں ہے۔ شک تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کانچی نے اس کے دل کی بات جان لی۔ اور بولی۔

"بُوا تو تم کو مہاتما سمجھتا ہے۔ بولتا ہے یہ دوسرا اوانسن صاحب ہے۔ مگر دوسرا ایسا نہیں سمجھے گا۔ ہر آدمی نہیں جانتا کہ تم کیسے ہو۔ اور بڑے لوگ تو بری باتیں ہی سوچتے ہیں۔"

منیش ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ لیکن اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس نے کوئی غلطی کی ہے۔ کانچی بولی۔

"اچھا کھانا سویرے کھا لو۔ بُوا بھی نہیں ہے۔ میں سویرے چلی جاؤں گی۔"

اور جا کر کھانا لے آئی۔ منیش نے چپ چاپ کھانا کھا لیا۔ وہ برتن اٹھا کر چلی گئی۔ پھر واپس نہیں آئی۔ کھانا کھا کر جب منیش پلنگ پر لیٹ گیا تو کانچی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اُسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن لال بہادر نے بتایا کہ لڑکا شادی کرنے کو تیار ہے۔ اور جلدی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی بہن کو بلایا ہے۔ لیکن کانچی کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے۔ اور اس نے کہہ دیا ہے کہ وہ ابھی بیاہ نہیں کرے گی۔ لال بہادر بہت اداس تھا۔ منیش نے کہا۔

"بے وقوف تو نہیں ہے کانچی۔ اُسے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے۔ اتنا اچھا آدمی پھر کہاں ملے گا؟"

لال بہادر بولا۔

"پگلی ہے صاحب۔ رات ہم سے بہت جھگڑا کیا۔ بولتا ہے۔ صاحب کا بیاہ ہو جائے گا تو ہم بیاہ کا بات سوچے گا۔ ابھی بیاہ کر کے چلا جائے گا تو اس کا کام کون کرے گا؟"

منیش کا دل دھک سے ہو گیا۔ یہ کیا؟۔۔۔ اس کی تکلیف کا خیال کر کے کانچی بیاہ نہیں کرے گی۔ اپنی زندگی اور بھلائی برائی کو نہیں سمجھتی۔ لال بہادر بولا۔

"اس کو آپ سمجھاؤ صاحب۔ آپ کا بات مانے گا۔ اس کا بیاہ ہو جائے گا تو ہمارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

منیش بولا۔

"میں ضرور سمجھاؤں گا۔"

لال بہادر چلا گیا۔ وہ بہت اُداس تھا۔ منیش کو بہت افسوس ہوا۔ کانچی نے اس کے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کانچی آئے گی تو اسے سمجھائے گا۔ اور کہے گا کہ بیاہ کرلے۔ ویسے وہ دل ہی دل میں ڈر بھی کہ نہ جانے کانچی اس کی بات مانے یا نہ مانے یا کیا جواب دے۔

کانچی آئی اور اس نے چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر اُن کی جگہ پر رکھنا شروع کیا۔ منیش بولا۔

"مجھے بڑی خوشی ہے کانچی تمہارا بیاہ ہونے والا ہے۔"

کانچی جھٹکے سے مڑی اور بولی۔

"نہیں تو۔"

منیش نے آہستہ سے کہا۔

"لال بہادر بول رہا تھا۔"

کانچی کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا اور وہ بولی۔

"میں نے کہہ دیا ہے۔ میں بیاہ نہیں کروں گی۔"

منیش نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"لال بہادر کہہ رہا تھا کہ پڑھا لکھا آدمی ہے اور تین سو روپے مہینہ کماتا ہے۔"

"تین سو روپے کمانا ہے تو اس سے بیاہ کرنا ضروری تو نہیں"
منیش کے پاس اور کچھ کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"تمہیں سوچنا چاہئے۔ تمہارا باپ...."

کانچی کا چہرہ میلا پڑ گیا اور وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم پر بوجھ بن گئی ہوں تو کہہ دو نہ آیا کروں"

اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ منیش سوچنے لگا۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ لیکن اس کو سمجھانا بے کار تھا۔ سات مہینے کرسیانگ میں رہنے کے بعد یہ جان گیا تھا کہ پہاڑی لوگوں کی یہ بڑی کمزوری ہے۔ جو بات اُن کے دماغ میں آجاتی ہے، وہ دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر نکلتی نہیں۔ ان لوگوں کو سمجھانا بے کار ہے۔ منیش نے کوئی بات نہیں کی۔ ناشتہ ختم کر کے کپڑے بدلے اور آفس چلا گیا۔
جب آفس سے واپس آیا تو کمرہ درست تھا۔ اس کی ہر چیز سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا کھایا اور بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن کانچی نہیں آئی۔ لال بہادر آیا تو اس سے پوچھا۔

"کانچی کہاں ہے؟"

لال بہادر بولا۔

"آپ کا سب کام کر کے گھر چلا گیا"

منیش چپ ہو گیا۔ کوئی بات اس سے نہیں پوچھی۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ ایک گھنٹہ بعد آفس چلا گیا۔ اور وہاں کے کاموں میں الجھا رہا۔ جب واپس آیا تو لال بہادر نے چائے لا کر دی۔ کانچی اس وقت بھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ صبح اور شام کے وقت وہ

مسرور رہتی تھی۔ منیش نے پوچھا۔

"کانچی کہاں ہے؟"

"گھر پر ہے صاحب۔ ہم سے کھوب جھگڑا کیا۔ بولا۔ تم صاحب سے کاہے کو بولا"

لال بہادر نے اکتاہٹ کے انداز میں کہا۔ منیش نے کہا۔

"جاؤ۔ اسے بلا لاؤ"

لال بہادر گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔

"نہیں آتا ہے صاحب۔ بگڑی ہے"

منیش کچھ نہیں بولا۔ اس کو اندازہ تھا کہ کانچی خفا ہے اور جب تک اس کا غصہ ختم نہیں ہوگا کسی کی بات بھی نہیں سنے گی۔ اس نے پھر بلانے کے لئے نہیں کہا۔ باہر برآمدے میں کسی کے پاؤں کی چاپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے لال بہادر سے کہا۔

"دیکھو کون آدمی ہے"

لال بہادر باہر گیا اور واپس آکر بولا۔

"بوسکن صاحب"

منیش نے لال بہادر سے کہا۔

"چائے باہر لے چلو"

اور خود اپنی چائے کی پیالی لئے ہوئے باہر چلا گیا۔ مسٹر بوسکن نے اسے دیکھتے ہی اپنی داڑھی کھجا کر کہا۔

"مسٹر منیش معاف کرنا۔ میں نے تکلیف دی۔ شاید ابھی آفس سے آرہے ہو..."

منیش نے کہا۔

"ہاں کوئی بات نہیں۔ دیر سویر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کیا بات ہے۔ بیٹھو پہلے چائے پیو۔"

مسٹر بوسکن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"چائے پیوں گا اور کچھ کھاؤں گا بھی۔ آج دن کو کھانا کھانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

منیش نے لال بہادر سے کہا۔

"صاحب کے لئے کچھ کھانے کو اور تازہ چائے بنا کر لاؤ۔"

لال بہادر چائے کی ٹرے لے کر چلا گیا۔ منیش مسٹر بوسکن کی عزت کرتا تھا اور اس کی بے غرض خدمات سے متاثر تھا۔ اس نے پوچھا۔

"اس وقت کیسے تکلیف کی؟"

مسٹر بوسکن مسکرایا اور بولا۔

"بھکاری جب بھی آتا ہے تو بھیک مانگنے کو آتا ہے۔"

وہ خوب زور سے ہنسا۔ منیش نے کہا۔

"اپنے لئے تو نہیں۔"

مسٹر بوسکن نے جواب دیا۔

"اپنی تسکین کے لئے۔"

منیش نے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔ تم تو دوسروں کے لئے کام کرتے ہو۔ اپنا چین آرام چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ اور تکلیف کے ساتھ زندگی گزار رہے ہو۔"

مسٹر بوسکن سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔

"یہ سب لفظوں کا فریب ہے مسٹر مینش۔ ہم سب لوگ اپنی تسکین کے لئے کچھ کرتے ہیں۔ میں بھی جو کچھ کرتا ہوں وہ اپنی تسکین کے لئے۔ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے کام کرتا ہوں۔ بڑے بڑے لیڈر، ملک اور قوم کے نام پر لڑائیاں لڑتے ہیں۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ تاریخ میں ان کا نام لکھا جاتا ہے۔ ان کو ہیرو کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اپنوں اور دوسروں کے قتل کا سامان کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے ملک والوں کی حالت سدھارتے پچھلے ہوئے لوگوں کو ان کے حقوق دلاتے۔ ان کی حفاظت کرتے اور ان کو ترقی کی راہ پر لگا دیتے تو زیادہ بڑے آدمی ہوتے۔ لیکن دوسرے ملکوں سے لڑائی چھیڑ کر اس پر اور اپنے ملک پر بھی تباہی لاتے ہیں۔ بے شمار آدمی مارے جاتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو تو یہ لوگ عزت کے مستحق نہیں۔ مجرم ہیں اور سزا کے مستحق ہیں۔ یہ سب کچھ اپنی تسکین کے لئے کرتے ہیں۔"

ایسی ہی بات ایک بار مسٹر بوسکن نے فادر رسل سے کہہ دی تھی۔ اور فادر رسل اس سے رنج ہو گیا تھا۔ اور اس سے کفارے کے لئے اعتکاف میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ لیکن مسٹر بوسکن نے انکار کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ان پادریوں کا اصول نرالا ہے۔ جو لوگ ان کی بات مان لیتے ہیں ان کے گناہوں کو یہ لوگ چھپاتے ہیں اور اعتراف کرنے پر معاف کر دیتے ہیں — فادر رسل مسٹر بوسکن کے کاموں کی تعریف کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ بوسکن اچھا آدمی ہے لیکن اچھا عیسائی نہیں ہے۔ اور مسٹر بوسکن کہتا تھا کہ اُسے فادر رسل کی سند کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اپنی تسکین کے لئے۔ اور پادری جو کچھ کرتے ہیں وہ صرف عیسائیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے۔ ان کو عیسائیوں کی فکر ہوتی ہے لیکن غیر عیسائیوں کی نہیں۔ میں نہیں مانتا کہ جو لوگ خدا کی

لوگ سے محبت نہیں کر سکتے وہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔ فادر رسل کو مسٹر لوبسکن حضرت عیسےٰ کا گدھا کہتا تھا، جو عیسائیت کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا۔ لیکن اس کی روح کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ فادر رسل اور مسٹر لوبسکن میں دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

مسٹر لوبسکن نے ناشتہ کیا، چائے پی۔ اور بولا۔

"اچھا اب میں جاؤں گا۔ تم مجھے جو کچھ دے سکتے ہو۔ دے دو۔ ضرورت ہے۔"

منیش بولا۔

"کچھ دیر اور بیٹھو۔ کچھ باتیں کریں۔"

مسٹر لوبسکن زور سے بولا۔

"نائیں بابا۔ مجھ کو نیچے جانا ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ کل دس بجے وہاں لوگ آئیں گے، یہاں زیادہ دیر بیٹھ جاؤں گا تو پہنچ نہیں سکوں گا۔"

منیش نے کچھ روپے لا کر مسٹر لوبسکن کو دئے۔ اور وہ چلا گیا۔ منیش سائبان سے اتر کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ کن چن چنگا کی چوٹی ڈوبتے کرنوں سے لال ہو رہی تھی۔ اور نیچے وادی میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ منیش کو یہ نظارا بہت پسند آیا۔ اس کا جی چاہا کہ بیٹھ کر لفظوں میں اس کی تصویر اتار لے۔ لیکن وہ نظارے میں ڈوبا اور ٹہلتا رہا۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو کمرے میں چلا آیا۔ ٹھنڈک بھی اور دنوں سے کچھ زیادہ ہی اس نے محسوس کی۔ اس نے لال بہادر کو پکارا۔ وہ آیا تو اس سے پوچھا۔

"کانچی نہیں آئی؟"

لال بہادر جیسے جھلایا ہوا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"وہ پگلی ہے صاحب۔ اس کا بات مت کرو۔"

دو دن ہو گئے۔ منیش کے سامنے کانچی نہیں آئی۔ جب وہ آفس چلا جاتا تو وہ اس کی ساری چیزیں درست کر دیتی اور گھر چلی جاتی تھی۔ اس سے منیش کو اور بھی الجھن تھی۔ بات صاف تھی کہ کانچی کو کچھ غصہ تھا۔ ورنہ اس کے سارے کام پہلے ہی کی طرح کر دیا کرتی تھی۔ منیش کے لئے اس لڑکی کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اگر غصہ ہے تو سارے کام کیوں کر جاتی ہے۔ لال بہادر نے اسے بتایا تھا کہ وہ آدمی جس سے وہ کانچی کا بیاہ کرنا چاہتا تھا دو دن رہ کر کلکتہ لوٹ گیا تھا۔ اس نے بہت افسوس کے ساتھ کہا تھا۔

"صاحب اتنا اچھا لڑکا اب کانچی کو نہیں ملے گا۔ پڑھا لکھا، نیک اور اچھا کمانے والا"

لال بہادر کو کانچی پر غصہ تھا۔ منیش کو بھی افسوس ہوا۔ پہاڑی لوگوں میں تعلیم نہیں کے برابر تھی۔ اُس نے کسی طرح پڑھ لکھ لیا تھا اور کسی آفس میں کام کر رہا تھا۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ کانچی کی زندگی عزت اور آرام کے ساتھ گذر جاتی۔ لیکن اس نے بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وہ واپس چلا گیا تھا۔ منیش نے لال بہادر سے کہا۔

"کانچی کو بلا لاؤ۔ اس سے ضروری کام ہے۔"

لال بہادر غصے میں بولا۔

"پگلی ہے۔ چھوڑیئے اس کو۔"

لال بہادر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کانچی آئی اور دروازے پر ہی کھڑی بولی۔

"کیا ضروری کام ہے جو بلایا ہے"۔

منیش نے اسے دیکھا اور بولا

"تین دن سے تم کو نہیں دیکھا، جب آفس جاتا ہوں تو تم کمرہ ٹھیک کر کے چلی جاتی ہو۔ میں نے تم کو دو بار بلا بھیجا مگر تم نہیں آئیں"۔

کانچی کمرے کے اندر آگئی، دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔

"میں نوکر تو نہیں ہوں کہ ہر وقت یہاں رہوں۔ یا جب تم بلا بھیجو تو دوڑی آؤں۔"

منیش کو اس کا جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ ایسے جواب کی اُسے امید نہیں تھی۔ اتنے روکھے انداز میں کانچی نے اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ منیش اس کا چہرہ تکتا رہ گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر نہ غصے کا نشان تھا اور نہ خوشی کا۔ پہلے ایک دو بار اس نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ لیکن مسکرا کر اور بناوٹی انداز میں۔ اور وہ جو کچھ بولی تھی، اس کا مطلب وہ نہیں تھا جو لفظوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ منیش نے کہا۔

"کانچی مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسا سوکھا جواب دو گی۔ اب سمجھا۔ سچ سچ تم مجھ سے غصہ ہو اور اسی لئے تین دن سے میرے سامنے آئیں بھی نہیں"۔

کانچی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ہاں میں تم سے غصہ ہوں۔ تم چاہتے ہو کہ میرا بیاہ ہو جائے۔ چاہتے ہو کہ چلی جاؤں۔ نہیں چاہتے کہ تمہارے سامنے آؤں۔ تو کیوں آؤں؟"

منیش اس کا جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ بیاہ کر لینے کی رائے دینے کا مطلب اس لڑکی نے کیا نکالا ہے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں.... میں.... میں...."

کانچی نے بات کاٹ دی اور بولی۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں ـــ"۔

منیش ذرا رک رک کر بولا۔

"کانچی میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں"۔

مگر کانچی پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بولی۔

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ میں اپنی بھلائی اور برائی کو سمجھتی ہوں۔ میں بچی نہیں ہوں"۔

منیش کو کانچی کی بات بری لگی۔ اب وہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور اس پر اپنا اثر ڈالنا چاہ رہی تھی۔ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"تو تم میرا کام کیوں کرتی ہو۔ تم نوکر تو نہیں۔ میں تو نہیں کہتا تم کو کام کرنے کو"۔

کانچی بھی تیز ہو کر بولی۔

"اس لئے کر دیتی ہوں کہ کوئی دوسرا تمہارا کام کرنے والا نہیں ہے۔ تم کو تو یہ بھی خبر نہیں رہتی کہ کس حال میں ہو"۔

منیش کو سچ مچ غصہ آگیا اور وہ بڑے روکھا پن کے ساتھ بولا۔

"مطلب یہ کہ تم مجھ پر احسان کر رہی ہو۔ میں نے تم سے احسان کی بھیک نہیں مانگی"۔

کانچی کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر چلی گئی۔ منیش پکارتا رہا۔ لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ منیش اپنے دل میں شرمندہ

اور دکھی ہوا۔ خواہ مخواہ اس سے تیز ہو کر بولا۔ اور کانچی کو دکھ پہنچایا۔ جتنا کام وہ کر دیتی ہے، اس کا احسان ہے۔ وہ اس کا کتنا زیادہ خیال کرتی ہے۔ اس نے صرف اس لئے بیاہ نہیں کیا کہ وہ بیاہ کر کے چلی جائے گی تو اسے تکلیف ہو گی۔ ورنہ اس عمر میں لڑکیاں انتظار کرتی رہتی ہیں کہ کوئی ہاتھ پکڑ کر لے جانے والا آئے۔ اور لے جائے۔ اور اس نے آ جانے والے کو لوٹا دیا تھا۔ منیش کی طبیعت بوجھل ہو گئی۔ اور تھکن محسوس کرنے لگا۔ اور وہ اپنے بستر پر لیٹ رہا۔ سوچنے لگا۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ کیا سوچتی ہے۔ کیا کرے گی۔ اس کا باپ بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ ماں مر گئی تو اس نے دوسرا بیاہ نہیں کیا کہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ مگر اسے باپ کی پریشانی کا بھی خیال نہیں۔ ضدی لڑکی ہے۔

صبح کے وقت موسم گدلا تھا۔ تھوڑا کہاسا دیکھ کر ڈرا کہ پھر بڑھ نہ جائے۔ منیش نے خود دروازہ کھولا اور لال بہادر کو آواز دی۔ ذرا دیر میں کانچی چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ اس نے چائے پیالی میں انڈیل کر منیش کو دی۔ منیش نے پیالی لے لی، اور اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں ملتے ہی کانچی آہستہ سے بولی۔

"مجھے معاف کر دو۔ کل میں نے تم کو سخت بات کہہ دی تھی۔ پہاڑی لڑکی ہوں بے وقوف۔"

منیش کو ہنسی آ گئی۔ کتنی سادہ دل لڑکی ہے۔ وہ بولا۔

"تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ غلطی میری تھی۔ تم میری نوکرانی نہیں جو میرا حکم مانو۔"

کانچی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اور وہ الجھی آواز میں بولی۔

"بولو تم نے معاف کر دیا۔"

منیش بولا۔

"تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ معافی کس بات کی ہے؟"

اور ہنس پڑا۔ کانچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور لجاجت کے ساتھ بولی۔

"بولو۔ معاف کر دیا۔"

منیش زور سے ہنستے ہوئے بولا۔

"جاؤ۔ معاف کر دیا۔ مگر میری بات ماننا۔"

کانچی مسکرادی اور بولی۔

"وہ کلکتہ لوٹ گیا۔"

"کون۔ ؟"

"وہی جیت سنگھ جو بیاہ کرنے آیا تھا مجھ سے۔"

منیش نے پہلی بار اس کا نام سنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ کانچی دیوار سے لگ کر کھڑی ہنسنے لگی۔ منیش نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہنس کیوں رہی ہو۔"

کانچی ہنستی ہوئی بولی۔

"بڑا جیت سنگھ تھا، جیتنے والا۔ میں نے اُسے ہرا دیا۔ وہ ہارا سنگھ بن گیا اور کلکتہ بھاگ گیا ——— بے چارہ۔"

اُس کی بات سن کر منیش کو ہنسی آگئی، مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اور کانچی سے بولا۔

"تم بے وقوف ہو۔"

کانچی مسکرائی اور ہونٹ بچکا کر بولی۔

"میں نے عقل مند ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے۔"

منیش چپ ہو گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر چائے کا ایک گھونٹ پی کر بولا۔

"مگر بتاؤ۔ تم نے بیاہ کرنے سے انکار کیوں کر دیا؟"

کانچی نے آنکھیں جھپکائیں اور بولی۔

"یہی سوال میں تم سے کرتی ہوں۔"

منیش نے جواب دیا۔

"میری ماں لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ جب کوئی پسند کی لڑکی مل جائے گی اور بات پکی ہو جائے گی تو بیاہ ہو جائے گا۔"

کانچی ہنسنے لگی اور بولی۔

"تو ابھی تک تم کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی؟"

منیش بولا۔

"میری پسند کا سوال نہیں۔ میری ماں کی پسند کا سوال ہے۔"

کانچی نے فوراً جواب دیا۔

"یہ طریقہ غلط ہے۔ بیاہ کا مسئلہ ان لوگوں کا ہے جن کا بیاہ ہوتا ہے۔ ماں باپ کا نہیں۔ لڑکی یا لڑکے کو پسند کرنے کا حق ماں باپ کو نہیں۔"

منیش جانتا تھا کہ وہ بحث کرتی جائے گی۔ اس کا دماغ انگریزوں جیسا بن گیا تھا۔ اور وہ کبھی ہندستانی طریقے کی تائید نہیں کرے گی۔ اس نے کانچی سے سوال کر دیا۔

"مگر تم نے شادی کرنے سے انکار کیوں کر دیا۔؟"

کانچی نے فوراً جواب دیا۔

"میرا دل نہیں چاہا۔ اس آدمی سے بیاہ کرنے کو کیسے تیار ہو جاتی، جس کو جانتی بھی نہیں ہوں۔ اور ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ نہیں جانتی کہ آئندہ کیا سوچوں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جس آدمی کو نہیں جانتی اس سے ہرگز بیاہ نہیں کر سکتی۔ بازار سے سامان خریدنا تو نہیں۔ کسی کو دل سے قبول کرنا بیاہ ہے —— ہاں تمہارا بیاہ ہو جائے ——

منیش نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"تم کو میرے بیاہ کی فکر کیوں ہے۔؟"

کانچی مسکرائی اور بولی۔

"ضروری نہیں کہ ہر بات تمھیں بتا دوں۔ مگر تم غصہ ہو جاؤ گے اس لئے تم کو بتا دیتی ہوں۔ تم بچوں کی طرح بھولے اور بے فکر ہو۔ تم کو اپنے آفس اور اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں۔ کسی بات کی خبر نہیں۔ تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کو کس چیز کی ضرورت ہے۔"

منیش نے اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کیا۔ آخر کانچی اُسے کیا سمجھتی ہے۔ وہ بچہ تو نہیں اور کانچی کو اس کی رکھوالی پر تو مقرر نہیں کیا گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ چپ چاپ چائے پیتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ کانچی کو ناخوش ہونے کا موقع نہیں دیا جائے۔

دو مہینے گزر گئے۔ منیش کی زندگی اپنی بنائی ہوئی لیکھ پر چلتی رہی۔ گھر، آفس، گھر، کتابیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی ہر چیز کی طرف سے بے پرواہ رہتا تھا کپڑے اور روپے پیسے تک سے۔ جیسے اس کے ہر کام اور آرام کی ذمہ داری کانچی پر ہی۔

اسے کسی کام کے لئے کم ہی کہنا پڑتا تھا۔ وہ خود ہی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ بلکہ کانچی کے خیال کرنے کی وجہ سے اس کی بے پروائی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی منیش سوچتا تھا کہ کانچی نہ ہوتی یا بیاہ کر کے اپنے مرد کے ساتھ چلی جاتی، تو اس کا کیا ہوتا۔ کون اس کی چیزوں کی دیکھ بھال کرتا۔ بھگوان نے خاص مہربانی کی تھی جو کانچی کو اس پر اتنا مہربان بنا دیا تھا۔

ایک شام منیش دفتر سے واپس آیا تو کانچی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اس کے لائے ہوئے سارے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی لائی ہوئی ساڑی، بلاؤز اور کوٹ منیش کے پاس آکر اس سے بولی۔

"تمہارے لائے ہوئے کپڑے میں نے پہن لئے۔"

منیش نے غور سے دیکھا۔ کانچی اچھے کپڑوں میں بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ وہ بولا۔

"ان کپڑوں میں تم کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔"

کانچی مسکراتی ہوئی بولی۔

"اور مجھے بھی کہ تم خوش ہو گئے۔"

منیش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لو تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔"

اور جیب سے خط نکال کر دیا۔ خط اس کی ماں نے لکھا تھا۔ بیاہ کی بات پکی ہو گئی تھی۔ پندرہ دن کے اندر فرصت لے کر بلایا تھا۔ کانچی نے خط پڑھا اور بولی۔

"مبارک باد۔"

منیش کو کانچی کی آواز عجیب سی لگی۔ جیسے اس نے دل سے مبارکباد نہیں دی تھی۔ اس کی

سمجھ میں نہیں آیا۔ کانچی نے سچ مچ مبارکباد دی تھی یا طنز کیا تھا۔ اس نے سوال کر دیا۔

"اب تو تمہیں خوشی ہوئی نا۔؟"

کانچی نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اور آہستہ سے بولی۔

"ہوں"

جیسے اس کی زبان میں طاقت نہیں تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل کر باہر چلی گئی۔۔

کبھی کبھی کانچی کی حرکتیں منیش کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس وقت بھی ویسا ہی ہوا۔ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔ اگر واقعی اسے خوشی ہوئی تو بے وقوف لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تیتی آ جائے تو اس کا آنا بھی پسند نہ کرے۔ عورتیں بہت حاسد ہوتی ہیں۔ خاص کر اپنے پتی کے آس پاس کسی دوسری عورت کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور اگر خوشی نہیں ہوئی تو پھر یہ جھوٹ کیوں بولا ہے۔

دوسرے دن منیش نے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ ساتھ یہ بات کانچی کو بھی بتا دی۔ منیش نے یہ بھی بتا دیا کہ بات کہاں پکی ہوئی ہے۔ اور سرلا کی تصویر بھی لے کے دکھا دی۔ سرلا دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ گریجویٹ اور خوب صورت بھی۔ لیکن اس کے آگے وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مزاج کیسا ہے۔ گھر کو سنبھالنے کا سلیقہ ہے یا نہیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ تار دے دیا ہے کہ وقت سے پہلے گھر پہنچ جائے گا۔ کانچی کھڑی سنتی رہی۔ جیسے اس پر کوئی اثر نہ ہو۔ نہ خوشی ہوئی اور نہ رنجش۔ وہ بولی۔

"دو تین دن میں ساری چیزیں ٹھیک کر دوں گی۔ جو چیزیں لے جانا چاہتے ہو بتا دینا۔"

منیش بولا۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو چھٹی کی درخواست دی ہے۔"

کانچی بولی۔

"اطمینان کے ساتھ ہر چیز رکھ دوں گی۔ کوئی چیز چھوٹ نہ جائے۔"

منیش بولا۔

"میرے بیاہ کی تم کو جلدی ہے۔"

کانچی بولی۔

"تمہاری پتنی آجائے تو میری جان چھوٹے۔"

منیش ہنسا اور بولا۔

"یعنی اب میں بھاری ہو رہا ہوں۔"

کانچی سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔

"جس کا حق ہے اسے ملنا چاہیے۔ ابھی تمہارا کام اس لئے کر دیتی ہوں کہ تمہارا کوئی نہیں ہے۔"

کانچی کی آواز میں کپکپی اور اس کی مسکراہٹ بناوٹی تھی۔ منیش نے اسے محسوس کیا۔ لیکن سمجھ نہیں سکا۔ کیوں؟ وہ کانچی کو دیکھتا رہا۔ کانچی اسے دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ منیش اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ دوسرے کمرے میں کام کرتی رہی۔ پھر دوسرے راستے سے نکل کر چلی گئی۔ منیش اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر کانچی نے اس کا موقع دیا ہی نہیں۔

وقت گزرتا گیا۔ منیش کی چھٹی منظور ہوگئی۔ اس نے لال بہادر اور کانچی سے بھی کہہ دیا کہ

کس دن جائے گا۔ اور کب لوٹ کر آئے گا۔ اسے یقین تھا کہ کانچی اس کی پتنی کی اچھی دوست بن جائے گی۔ اس کے بعد پھر کانچی بھی بیاہ کر کے اپنے گھر چلی جائے گی۔ اس کی زندگی بھی اپنی راہ پر لگ جائے گی۔ لیکن وہ خود اپنے دل کے اندر ذرا الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ کانچی روز بروز بدلتی جا رہی تھی۔ وہ عام طور پر سست رہتی تھی۔ اس کے سارے کام کر دیتی تھی۔ مگر اس کے پاس کم آتی تھی۔ اس سے باتیں نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ پوچھ لیتا تو مرجھائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے دیتی۔ کانچی کا بدلا ہوا انداز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس سے پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ کانچی اس کو موقع دیتی ہی نہیں تھی کہ وہ اس سے باتیں کرے۔ اور اس کی وجہ سے وہ الجھا الجھا سا رہتا تھا۔

منیش کے گھر جانے کا دن آ گیا۔

صبح سویرے چائے لال بہادر لایا۔ اُسے امید تھی کہ چائے کانچی لائے گی اور خوش ہو کر رخصت کرے گی۔ مگر وہ نہیں آئی۔ ادھر اس کے سامنے آتی تھی تو ایسے وقت میں جب لال بہادر بھی ہوتا تھا، یا پھر وہ آفس جا چکا ہوتا تھا۔ منیش بالکل نہیں سمجھ سکا تھا کہ بات کیا ہے۔ کانچی اس طرح کیسے بدلتی جا رہی ہے۔ دوسرے وہ سست اور اداس سی رہتی تھی۔ کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس کی صحت اچھی ہی تھی۔ منیش کو جائے پی کر جانا تھا۔ کار اس کے لئے سڑک پر کھڑی تھی۔ بس چائے پی کر جانے والا تھا۔ لیکن کانچی کا پتہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چائے پی کر کار سے سلی گوڑی جائے گا۔ دن بھر وہاں کارخانے میں رہے گا اور رات کی گاڑی سے کلکتہ چلا جائے گا۔ اور وہاں سے اپنے گھر۔ جب کانچی دیر تک نہیں آئی۔ تو منیش نے لال بہادر سے پوچھا۔

"کانچی کہاں ہے؟"

لال بہادر بولا۔

"ہم دیکھا نہیں صاحب۔ ہم اُٹھا تو باہر گیا تھا۔ گھر میں نہیں تھا۔"

منیش نے سوچا کہ جاتے وقت سو روپے لال بہادر کو دے گا اور سو روپے کانچی کو۔ یہ بھی سوچا تھا کہ واپسی میں کلکتہ سے ان دونوں کے لئے چیزیں خرید کر لائے گا۔ اور دونوں اس کی بھینٹ کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کانچی سامنے ہو اور اپنی عادت کے مطابق مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرے۔ مگر اس کا پتہ نہیں تھا۔ اس سے منیش اپنے دل کے اندر عجیب سی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے لال بہادر سے کہا۔

"جاؤ اسے بلا لاؤ۔ اب تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔ اسے بہت سی باتیں بتا دوں۔"

لال بہادر جیسے پہلے ہی سے جھلایا ہوا تھا۔ وہ بولا۔

"صاحب اس کو چھوڑ دو۔ وہ پگلی ہو رہی ہے۔ اس کا ماتھا ٹھیک نہیں رہتا۔ کبھی اکیلے بیٹھی روتی رہتی ہے۔ لگتا ہے اس کو ہسٹریا کا بیماری ہو گیا ہے۔"

منیش نے لال بہادر کو دیکھا۔ اور بولا۔

"جا کر دیکھو۔ گھر میں ہو گی۔ بلا لاؤ۔"

لال بہادر چلا گیا۔ اور منیش سوچنے لگا۔ آخر یہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ ادھر وہ بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے پہلی کانچی نہیں رہ گئی تھی۔ آخر دور دور کیوں رہتی ہے۔ اور باتیں کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ حالانکہ ہر روز آتی ہے اور سارے کام کر جاتی ہے۔

لال بہادر آیا اور اس نے بتایا کہ کانچی نہ اپنے گھر میں ہے۔ اور نہ باورچی خانے میں۔ اس خبر سے منیش کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے اپنے دل کے اندر بے چینی سی محسوس کی۔

آخر یہ لڑکی کہاں گئی۔ اس نے لال بہادر سے کہا۔

"دیکھو ضرور گھر میں ہو گی"

لال بہادر چلا گیا۔ منیش کمرے سے باہر سائبان میں چلا گیا۔ کن چن چنگا کی چوٹی پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اور برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ نیچے وادی میں روشنی پھیلی جا رہی تھی۔ لیکن منیش کو کوئی چیز اچھی نہیں لگی۔ اس کی نگاہیں ہر طرف کانچی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ پھر کمرے میں چلا آیا۔ کانچی وہاں موجود تھی ــ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا منیش نے پوچھا۔

"تم کہاں تھیں؟"

کانچی نے ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور اس کے تلوے کی مٹی لے کر اپنے سر پہ ڈال لی۔ اور مری ہوئی آواز میں بولی۔

"جا رہے ہو۔ جاؤ۔"

"یہ کیا۔ کیا؟"

اس نے گھبرا کر کانچی کو اٹھایا۔ کانچی کھڑی ہو گئی نڈھال سی۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ ان میں آنسو بھرے تھے۔ وہ بہت روئی تھی۔ منیش نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا کانچی؟"

وہ روتی ہوئی بولی۔

"جاؤ ــ پھر کب آؤ گے؟"

وہ کچھ نہ بول سکی۔ منیش نے اس کے گالوں کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اسے دیکھا رہا

کانچی اسے دیکھتی رہی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔ مگر اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ گئیں۔ منیش نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ کانچی نے اپنا سر اس کی چھاتی پر ڈال دیا اور بولی۔

"جاؤ۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"

منیش کا حلق جیسے سوکھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے سے جیسے یکایک ہر چیز غائب ہو گئی۔ اور وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں کانچی۔"